1449

میری ہر ایک آہ میں رقصاں اثر کی بجلیاں
نار دوزخ سے بھی بڑھکر ہے مرا سوز نہاں

سوز و ساز

نتیجۂ تخیل

محترمہ محمودہ صاحبہ رضویہ
مدیرہ مجلہ ہندوستانی

سنہ ۱۹۴۲ء
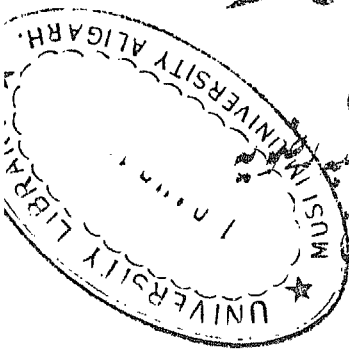
باہتمام آصف جاہ کاروانی ایم اے
ہندوستانی دار الاشاعت انجمن ترقی اردو کراچی سے شایع ہوا

(جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ)

بار اول — قیمت ایک روپیہ

انتساب
سیرۂ عمرؓ
کی
۳۲۹۷۴
M.A.LIBRARY, A.M.U.
U32974

Ram Babu Saksena Collection.
۳ ۲۹۷۹۴۴ ۳

فہرست مندرجات

MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH
UNIVERSITY LIBRARY

پیش نامہ

محترمہ محمودہ صاحبہ رضویہ نے جو جگہ اردو ادیبوں اور افسانہ نگاروں میں اپنے لیے پیدا کی ہے وہ انکی فطری ذہانت، اسقدر مشاہدہ، طبیعت کی موزونیت و میلان اور اپنے جذبات کو صحیح طور پر قلمبند کرنے کی قدرت کا نتیجہ ہے

مصنفہ محترمہ سے میری شناسائی کچھ برس پہلے کالج میں درس و تدریس کے سلسلے میں ہوئی۔ ان کے ادبی جواہر ریزے اور افسانے وغیرہ میری نظر سے گزرا کرتے۔ گو کہ مجھ ایسے محسوسات لطیف سے عاری خالص میکانی انسان کو جذباتی دنیا سے کوئی لگاؤ نہیں ہو سکتا تھا پھر بھی اُن کی شستہ و جاذب اثر تحریروں سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُن کے اصلی جذبات، فطری رجحانات اور ادبی خصوصیات کو صحیح طور پر سمجھنے کا پورا موقع مجھے اُس وقت سے ملا جب کہ انجمن ترقی اُردو کراچی کے ماہنامہ "ہندوستانی" کی ادارت کے فرائض ہم دونوں کے سپرد کیے گئے۔ مضامین کے انتخاب اور رسالہ کی اشاعت وغیرہ کے سلسلے میں اُن سے میری کافی بحث ہوتی اور جو ادبی رائے میں نے اُن کے متعلق قائم کی ہے اُسکی بنیاد محض حقیقت پر ہے

اگرچہ فاضل ادیبہ ادبی میدان میں اپنی شہسواری کا ثبوت دے چکی ہیں اور اُن کے ادبی شاہ پاروں کے دو مجموعے "دردانہ" اور "نالہ زار"

جو اس وقت تک منظرِ عام پر آچکے ہیں ہندوستان کے مختلف ادیبوں
اور نقادوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں لیکن میری رائے میں مصنفہ کا
یہ اصلی رنگ نہیں۔ اعلیٰ ترین خاندانی تربیت کے علاوہ آپ نے شاعر کا دل،
خوددار، لیے رہا، اور منظوم پرور طبیعت، حقیقت شناس و نکتہ فہم دماغ
استعداد مشاہدہ، شگفتہ زبانی اور فصیح بیانی پائی ہے۔ ان فطری خصوصیات
کا مشترکہ نتیجہ ادبی مقالات نہیں اصلاحی و معاشرتی افسانے ہو سکتا تھا
اور یہی وہ کوچہ ہے جہاں قدم رکھتے ہی انھوں نے اپنا سکہ جما دیا۔

"زود پشیماں" "آخری ہچکی" "دولت کی بھینٹ" وغیرہم ان کے بہترین
معاشرتی شاہکار ہیں اور قابلِ تقلید۔

مصنفہ کی سعی قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے اپنی زبان اور
خیالات سے اُردو اور قوم کی خدمت کا صحیح راستہ اختیار کیا ہے
اور مجھے خوشی ہے کہ انجمن ترقی اُردو کراچی کے ہندوستانی دار الاشاعت
نے اپنی اشاعات کا سلسلہ ان "مصورۂ معانی" کی تصنیف "سوز و ساز"
سے شروع کر کے ادبی قدردانی کا ثبوت دیا ہے۔

ڈی، جے، سندھ کالج کراچی
۸ اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء

کاروانی

۳۲۹۷۴

1939

دیباچہ

جب میں نے محترمہ محمودہ صاحبہ رضویہ کا پہلا افسانہ "آخری بجلی"
رسالہ ہندوستانی اکتوبر ۱۹۴۱ء میں پڑھا تھا تو میں نے اسے کچھ زیادہ اہمیت
نہیں دی تھی کیونکہ میں اسے ایک اتفاقی چیز سمجھا تھا۔ ہر مضمون نگار مختلف
پیرایہ ہائے بیان اختیار کرتا ہے اور جس وقت تک اس کے تمام مضامین کا مطالعہ
نہ کیا جائے کوئی رائے قایم کرنا آسان نہیں لیکن یہ خیال رفتہ رفتہ زائل
ہوتا گیا اور اب یہ صورت ہے کہ مجھے موصوفہ کی قوتِ افسانہ نگاری
سے انکار کی جرأت نہیں۔

میں نے محترمہ محمودہ کے افسانوں کو بغور پڑھنے کے بعد جو رائے
قایم کی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں پانچ باتیں خاص طور پر نمایاں ہیں

پہلی اور بہترین خصوصیت یہ ہے کہ لفظاً بھی اور معناً بھی متانت و
سنجیدگی کو بہت ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کوئی افسانہ ایسا نہیں جو ان امور
سے متجاوز ہو جو حلقۂ ادب و تہذیب کی حد بندی ہوتی ہے

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ افسانہ کی روح پاکیزہ ہوتی ہے اُنکے
افسانوں میں یا تو غربت و ناداری کے دردناک مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے
یا صنفِ نازک کے جذبات و احساساتِ لطیف کی صحیح ترجمانی۔ میرے

خیال میں موجودہ روش افسانہ نگاری سے ہٹ کر محض انسانیت کے راستے پر چلنا بہت بڑی خوبی ہے

تیسری خصوصیت واقعات کا تسلسل ہے جو پڑھنے والے کو بوردا شتہ خاطر کرنے کے بدلے دلچسپی میں محو رکھتا ہے

چوتھی خصوصیت کردار اور اسماء کا "شاعرانہ انتخاب" اور اظہار مدعا کیلئے عام فہم زبان کا استعمال ہے جو خواص کیلئے بھی اتنا ہی موجب تفریح ہے جتنا عوام کے لئے

پانچویں خصوصیت مناظر فطری کی وابستگی ہے مختلف افسانوں میں مختلف مقامات و ماحول سے جو بوقلمونی و رنگینی نگاہوں کے سامنے پیدا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ صرف اہل نظر کر سکتے ہیں

مجھے خوشی ہے کہ "ریگزار سندھ" میں ایک ایسی خاتون بھی موجود ہیں جن کی آبیاری فکر نے ایک لہلہاتا "نخلستان خیابون" پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اور یہ سبز و شاداب خیابان شرف اولیت کے علاوہ نشان راہ کا کام بھی دے سکیگا

افسر صدیقی

افسانۂ غم

کہتے ہیں کہ درد بھرے واقعات افسردگیٔ حیات میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اُن کا نقش کالجۓ کچھ ایسا گہرا ہوتا ہے کہ روح کے گوشے گوشے کو متزلزل کر دیتا ہے اور خونِ قلب کو منجمد۔ بہر حال ذیل کے واقعے اِس کی تصدیق ہو سکتی ہے جس کا تصور اب بھی میرے رباب زیست کو مرتعش کیے ہوتے ہے اور اُس کے ایک ایک تار کو آمادۂ بغاوت

(۱)

نہ چھیڑ اُنکے تصور میں اے بہار مجھے کہ بوئے گل بھی ہے اسوقت ناگوار مجھے

سرما کی اُس ناگوار سی شام کو جب گہری تاریکی کائنات پر مسلط تھی جیسے ذرّے ذرّے میں اُداسی جذب ہو کر رہ گئی ہے اور ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے گھاس کو لہرا رہے تھے: میں معمول کے مطابق گورِ غریباں کی طرف جا رہی تھی تاکہ رخصت شدہ روحوں کو گلِ ریحاں کی چند پتیوں سے اپنی یاد دلا دوں۔

شہرِ خموشاں کا سکوت یوں ہی کیا کم وحشتناک ہوتا ہے

اُس پر مستزاد چمگادڑوں کا سناٹا۔ کتاب مقدس کی آیتیں پڑھتے وقت ایسا
معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں کے خاموش مکینوں کو میرا دخل در معقولات
شاق گزرتا ہے اور جب بڑھتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ ساتھ چمگادڑیں
بھی ارد گرد چکر کاٹنے لگیں تو روح سے وابستہ لیکن نظروں سے دور ہستیوں
کو الوداع کہہ کر واپس آنے کے ارادے سے اٹھی۔

سر آرتھر کانن ڈائل کے روحانی قصے کس پر کپکپی طاری نہیں
کر دیتے لیکن اگر ان افسانوں کی جیتی جاگتی ہیروین اچانک کہیں سے
نمودار ہو جائے تو مارے خوف کے کیا حالت ہوگی۔ کیا آپ کی لرزہ خیز
چیخ فضا میں تہلکہ نہیں مچا دے گی۔

ایک ایسا ہی مجسمہ پر اسرار میرے سامنے موجود تھا۔ سر تا پا
سیاہ لباس میں ملبوس اور سامنے والی تازہ قبر پر جھکا ہوا جیسے کہ ہوا کے
تیز اور سرد جھونکوں سے کنول کا ننھا سا پھول جنباں ہو۔ چند مبہم اور
حسرتناک الفاظ بھی میرے کانوں تک پہنچے گویا کہ بے ثباتی کائنات
پر فریاد کناں ہیں۔

فرطِ تجسس و خوف سے میرا بُرا حال تھا کہ اس سیاہ پوش
ہستی نے اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اُف! وہ پیکر پاکیزگی۔ مجھے تو محسوس
ہوا کہ ایک پیکر الوہیت ہے جو آسمان سے دنیا کی رہنمائی کے لئے اتر آیا

ہے سنہرے اور لمبے بال آبشار کی طرح لہرا رہے تھے لیکن آہوئے رمیدہ کی سی آنکھوں میں صاف غم جھانک رہا تھا۔ قدرت کے ایسے شاہکار سے ڈرنا کیسی بے وقوفی ہے یہ سوچتے ہوئے میں دل کو ڈھارس دیتی ہوئی آگے بڑھی تاکہ کم از کم تسکین کے چند الفاظ ہی کہہ سکوں اور جذبات کی گرہ کو کھولنے کی سعی کرتی ہوئی اس حسین روح سے اس قدر آہ و زاری کی وجہ دریافت کروں لیکن جیسے ہی میں نے قدم اٹھایا آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھیں اوپر کو اٹھیں۔ ان سے حقارت کا ایک عمیق چشمہ ابل رہا تھا اور غمگین نظریں زبان خاموشی سے کہہ رہی تھیں کہ ہمیں اسی طرح آلام کے زیر سایہ بہنے دیا جائے۔ خوابوں کی دنیا سے نکل کر عالم حقیقت میں آنے سے ہمیں انکار ہے۔ روح کے ساکن تاروں کو جھنجھوڑ کر انھیں آوارہ خرام نہ کیا جائے"

اور پیشتر اس کے کہ میں ایک لفظ بھی کہنے کی ہمت کرتی۔ وہ حامل رازہائے سربستہ ہستی اٹھی۔ ایک یاس آلودہ نگاہ قبر پر ڈالی اور دیکھتے ہی دیکھتے برگد کے پھیلے ہوئے درختوں کے پیچھے غائب ہوگئی

(۲)

الیسے اک عالم برزخ کی تمہیدوں میں انتہائے غم و ارمان ہے عنواں میرا

دوسرے روز شہر خموشاں کی حدود میں داخل ہوتے وقت

بیحد متوحش تھی۔ کل والے واقعہ نے میری حساس طبیعت بُری طرح مضمحل
کردی تھی۔ "اللہ! یہ خاتون کون ہے؟ قضا و قدر نے کون سا دُرِ بے بہا
چھین کر اس کی آرزوؤں پر بجلی گرا دی اور قیام شب باشی کے لئے اس
مظلوم لڑکی نے کون سی جگہ منتخب کی ہوگی" انھیں تفکرات میں پیچاں
میں اس نئے مرقد تک پہنچ گئی۔ اس تصور سے دل ہی دل میں سہم
رہی تھی کہ اگر بے زبان اشیاء کو بھی یارائے گفتگو ہوتا تو مٹی کا ہر ذرہ
بتاتا کہ یہ ظالم زمین کیسی کیسی پاکیزہ صورتیں نگل چکی ہے۔ قبر کے عین مرکز
میں بیلے کی کلیوں اور گلاب کی پتیوں سے یہ الفاظ بنے ہوئے تھے

"روح دردانہ سلیم رمزی"

میں ایک عالم تحیر میں کھڑی دیکھ رہی تھی کہ وہی خاتون بھاگی بھاگی
آئیں دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور سانس بھی رکتا ہوا معلوم ہوتا تھا
"خدا کے لئے! آہ! خدا کے لئے!!! میرے رمزی کو نگاہوں سے تو
پوشیدہ کرادیا۔ اب قبر کی گہرائیوں میں تو نہ چھیڑو۔ ہٹو! نہیں میں
تمہیں نہیں چھیڑنے دونگی" شدت جوش سے انکی آواز بیٹھی جا رہی تھی
میں ششدر تھی کہ اس مخبوط الحواسی کا مقصد آخر کیا ہو سکتا
ہے کہ وہ بیدم سی ہو کر قبر سے لپٹ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع
کردیا۔ اب مجھے بھی یارائے ضبط نہ رہا۔ رقیق القلب تو ویسے ہی ہوں!

بجائے اس کے کہ اس وارفتگی کی وجہ دریافت کرتی خود بھی اُن کے ساتھ شریک گریہ ہو گئی

نہ معلوم کتنا عرصہ اس طرح گزر گیا اور کب تک عالم بیخودی میں بیٹھے رہتے اگر محافظِ شہرِ خموشاں آکر یہ طلسم نہ توڑ دیتا کہ دروازہ بند ہونے کا وقت ہو چکا ہے۔ مجھے واپس جانا چاہیئے

"لیکن یہ ! یہ خاتون" میں نے جیسے کہ ہوش میں آکر پوچھا "یہ کہاں ٹھیریں گی"؟

"یہیں ! اس قبر کے پاس ہی" مجاور نے افسردگی سے جواب دیا" یہ ایک نوجوان کی قبر ہے جسے گزشتہ ہفتہ دفن کیا گیا تھا باوجود منت وسماجت اور سخت ممانعت کے بھی یہ خاتون یہاں سے ایک لمحے کو علیحدہ نہیں ہوتیں"

"موج اگر اپنی روانی سے علیحدہ ہو سکتی ہے۔ بربط سے اُس کی لَے جدا رہ سکتی ہے اور روشنی سے تاریکی کا چولی دامن کا ساتھ نہ ہو" خاتون مذکور سسکیاں لیتی ہوئی بولیں "تب تو شاید میں بھی اُٹھ جاتی لیکن اگر نہیں تو اب جبکہ میری روحِ حیات کو ظالم فطرت نے بے بال و پر کر کے یہاں چھپا دیا میرا اُٹھ کانا اور کہاں ہو سکتا ہے"

اُن کی صدائے درد شہرِ خموشاں کی چہار دیواری سے

اسطرح ٹکرا رہی تھی جیسے ذرّے ذرّے میں پیوست ہو کر اُسے آہِ الم سے جلا دیگی

"عزیز بہن!" میں نے قلبی رنج محسوس کرتے ہوئے کہا "مجھے آپ سے بہت ہمدردی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنا شریکِ حال سمجھیے کیونکہ میں بھی ایسے صدمات سے آشنا ہوں لیکن یہ عرض کروں کہ ایسی بھیانک فضا میں آپ کا ٹھیرنا مناسب نہیں تو کچھ بیجا نہ ہوگا"

"جس فضا کو آپ بھیانک سمجھ رہی ہیں میرے لئے فردوس کے جنت نگاہ مناظر سے بڑھکر ہے۔ اُمیدوں کا مرکز جہاں روپوش ہو وہ جگہ بھی کبھی وحشتناک ہو سکتی ہے۔ آپ میری کتابِ حیات کے دلدوز بابسے واقف نہیں ورنہ یہ الفاظ زبان پر نہ لاتیں"

"اگر اس لائق سمجھا جائے تو خوش قسمت" میں نے اپنے کہے پر یک گونہ نادم ہوتے ہوئے جواب دیا

"نہیں! اب نہیں"!! وہ جیسے چونک کر بولیں "اس وقت میں اپنے رمزی سے دل بہلایا کرتی ہوں۔ وہ میرے منتظر ستاروں کی آڑ سے جھانک رہے ہیں۔ آپ جائیے مجھے تامّل کرتے دیکھ کر) بس جیسا کہ میں نے کہا۔ اب مجھے اکیلا چھوڑ دیجئے"

انھیں اس قدر مصر دیکھ کر میں بادلِ ناخواستہ اُٹھی لیکن یہ پوچھے بغیر پھر بھی نہ رہ سکی کہ "اتنی بے قراری کی آخر کیا وجہ ہے؟"

"نالۂ پُردرد کی تڑپ اور ایک خوں چکاں افسانۂ غم" اُن کا مختصر سا جواب تھا اور مجھے وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ

(۳)

دل تھا ترے خیال میں سب پہلے چمن چمن اب بھی روش روش ہے مگر پائمال ہے

گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ دردانہ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ خاتون مذکورہ کا نام تھا) کی خود فراموشی بڑھتی جا رہی تھی اس میں شک نہیں کہ انہیں مجھ پر کچھ کچھ اعتماد ہو چلا تھا اور مانوس بھی پہلے سے زیادہ تھیں لیکن دیوانوں کی طرح خود بخود بڑبڑاتے رہنا بچے دلوں کے گجروں سے رات دن قبر کو سجانا اور پھر کچھ یاد کر کے یک بیک آنکھوں میں آنسو بھر لانا یہ باتیں ہنوز روز اوّل کی سی تھیں

باوجود میرے سخت اصرار کے بھی وہ قبرستان سے علیحدگی پر راضی نہیں ہوئیں جب میں زیادہ مجبور کرتی تو وہ پُر حسرت نگاہوں سے قبر کو تکنے لگتیں یا اک آہ سرد بھر کر یہ کہہ کے خاموش ہو جاتیں کہ "اپنے رمزی سے دور رہ کر میں ہرگز زندہ نہیں رہ سکتی"

ایک شام جب میں قبرستان جانے لگی تو یہ ارادہ راسخ تھا کہ آج ضرور دُردانہ کی "رودادِ حیات" پوچھ کر رہوں گی۔ ایسی پیاری لڑکی کا یہ تباہ حال! اُف نہ معلوم فطرت بھی کیوں آنکھیں بند کیے بیٹھی ہے

وہاں پہنچتے ہی میں نے وہ منظر دیکھا جو دل پاش پاش کر دینے
کے لئے کافی تھا۔ دردانہ اک عالم استغراق میں قبر پہ جھکی ہوئی تھیں
افسردہ چہرہ شدتِ غم سے اور بھی زرد تھا اور لمبے لمبے گیسو اُلجھے ہوئے
میں خاموشی سے اُن کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی زبان کو
یارا نہ تھا کہ اس نیم مجنونانہ حالت میں اُنھیں متوجہ کرنے کی کوشش کرتی
شاید وہ اپنے رمزی سے محو تکلم ہوں
دردانہ ایک عجیب لہجے میں دھیمے دھیمے کچھ گا رہی تھیں
اُن کا درد بھرا راگ کانپتی ہوئی فضا میں لہرا رہا تھا اور درختوں سے
اُلجھتے ہوئے جھونکے ہمنوا تھے جیسے سینکڑوں افسردہ روحیں ماتم کناں ہوں
میں ذرا آگے بڑھی۔ اب یہ مرتعش آواز صاف سنائی دے
رہی تھی۔ دردانہ کہہ رہی تھیں ؎

وقتِ شب ہے شورشِ بزمِ جہاں خاموش ہے
قہقہے ساکت ہیں آوازِ فغاں خاموش ہے
زندگی ناکامیوں کا اضطرابِ جاں گداز
ہلکی ہلکی سرد آہوں کا عذابِ جاں گداز
گو فضائے دہر کیف آلود ہے سرشار ہے
ہلکی ہلکی آنچ میری روح میں بیدار ہے

کوئی دلچسپی نہیں رفتارِ صبح و شام میں
کچھ نہیں غیر از مصائب دامنِ ایّام میں

"بس کرو دردانہ بہن!" میں نے زیادہ سننے کی تاب نہ لا کر کہا "آہ! یہ گریۂ پیہم کب تک؟" - اور میں شدتِ تصوّر سے مغلوب ہو کر اُن کے قریب فرش پر بیٹھ گئی -

"بس اسی پر دعویٰ تھا کہ میری کتابِ زیست کے پُر الم ابواب سنوگی؟" دردانہ بمشکل تمام اپنے غمزدہ چہرہ پر پھیکا تبسم پیدا کرتے ہوئے بولیں

"اس میں شک نہیں کہ میری سب سے بڑی آرزو یہی تھی لیکن یہ بھی تو برداشت سے باہر ہے کہ تمھیں ہر وقت اس حال میں دیکھ کر بھی خاموش رہوں"

"میری ہمدرد بہن! آج تک باوجود اجنبیت کے جو حق رفاقت و دلدہی تم نے مجھ غریب الوطن کے ساتھ ادا کیا ہے اُس سے میں مجبور ہو گئی ہوں کہ اپنی دُکھ بھری کہانی سُنا ہی دوں لیکن یہ خیال مجھے اب تک روک رہا ہے کہ تمھارے حسّاس دل پر اسکا بہت گہرا اثر ہوگا

"کچھ پروا نہ کرو پیاری دردانہ! کیا انسانیت کا تقاضا اتنا بھی نہیں کہ اپنے ہم جنس کے دکھ درد سے کچھ آگاہی ہو سکے"

"اچھا جب تم اس قدر مشتاق ہو تو مجھے بھی کچھ عذر نہیں"

اور بد نصیب دُر دانہ نے اس طرح اپنا افسانۂ غم شروع کیا

(۴)

ماجرائے بلاکشاں نہ سنو　　نہ سنو میری داستاں نہ ہو

فقرہ فقرہ ہے اس کا پُر تاثیر　　ہو نہ جاؤ کہیں بلا میں اسیر

میں نہیں بتا سکتی کہ رمزی کو میرا شریک حیات بنانے کا خیال میرے والدین کے دل میں کب جاگزیں ہوا جب کہ قاضی ازل روز ازل سے ہی ہمیں ایک دوسرے سے وابستہ کر چکا تھا۔ میرے حقیقی ابن عم ہونے کی وجہ سے ہم دونوں میں کچھ غیریت نہیں تھی۔ برعکس اس کے وہ مجھ سے شاداں تھے اور میں اُن کی خوبیوں پر نازاں۔ آہ! وہ کیا تھے؟ میرے لئے کیا تھے؟ یہ شاید میں نہ بتا سکوں

چچا مرحوم کو اپنے فرزند کی ذہانت پر ناز تھا۔ وہ اپنی پونجی کی آخری پائی تک رمزی کی تعلیم پر خرچ کر چکے تھے اور اکثر فخریہ کہا کرتے تھے کہ میرا رمزی ایک روز جج یا بیرسٹر بنے گا لیکن افسوس کہ اُنکے ارمان دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ بی۔ اے کا نتیجہ نکلنے سے پیشتر ہی وہ بستر مرگ پر پڑ گئے۔ اسی افراتفری کی حالت میں رسم شادی ادا کی گئی اور ہم دونوں سلسلۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے

کہتے ہیں کہ ہر نو شادی شدہ جوڑے کو ایک دوسرے

سے اُنسیت ہوتی ہے لیکن ہماری الفت تو جنون کی حد تک پہنچ چکی
تھی۔ تاروں کی چھاؤں میں ندی کے کنارے پہنچ جانا اور موجوں کی روانی
کے ساتھ اپنی محبت کا موازنہ کرنا۔ چاند کی خنکی بھری کرنوں میں اپنے
درخشاں مستقبل کی تصویر قایم کرنا۔ یہ تھے وہ دلپسند مشغلے جنہیں مشغول
رہنے کی وجہ سے ہمیں رات کی سُست پڑتی ہوئی نبض کا پتا بھی نہ
چلتا تا وقتیکہ پہلی شعاعِ آفتاب پیامِ بیداری نہ لاتی

باپ کے انتقال سے رمزی ایک بڑا سہارا کھو چکے تھے لیکن
میری موجودگی کچھ زیادہ احساس نہ ہونے دیتی جب دن بھر کی تلاشِ کار
اور صبر آزمائیوں کے بعد وہ گھر آتے تو مجھے متبسم دیکھ کر اُن کی تمام
کلفتیں کافور ہو جاتیں اور اک والہانہ انداز سے میری انگلیاں اپنے
ہاتھوں میں تھام کر کہتے "دُردانہ! جہاں تم موجود ہو وہاں افکارِ دنیاوی
کا انکار کرنا تو خود اپنی بہشت کو جہنمی شعلوں کی لپیٹ میں لانا ہے"

تسلسلِ حیات اسی طرح جاری تھا لیکن اثاثہ تمام ختم
ہو رہا تھا حصولِ ملازمت آج کل جوئے شیر لانے سے کم نہیں اس لئے
رمزی کو خیال ہوا کہ اگر ایم اے کی ڈگری لے لی جائے تو شاید روزگار
کی کوئی سبیل نکل سکے۔ اُن کے والد کے سنہرے خواب، وکیل و
بیرسٹری کے اُن کی موت کے ساتھ ہی غائب ہو چکے تھے

ایم ۔ اے پاس کرنے کے لئے روپے کی ضرورت تھی اور گھر میں رقم کے نام سے سفر بھی نہ تھا ۔ بڑھتے ہوئے تفکرات سے رمزی کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ۔ ہر وقت کوئی دماغی انتشار اُن پر مسلط رہتا ۔ مسکراتے ہوئے چہرے پر یاس نے غلبہ کر لیا ۔ میرے پاس معمولی سے دو چار زیور تھے ۔ ان کی حقیقت ہی کیا تھی جب میری جان تک رمزی پر قربان تھی لیکن وہ اس بات سے سخت دلگیر ہوئے کہ مجھے زیور کی علیحدگی کا خیال بھی کیوں آیا اور کئی روز تک روٹھے رہے ۔ پر آہ ! وہ وقت بھی آ چکا تھا کہ جب کوئی چارہ نہ دیکھ کر یہی زیورات فروخت کئے جائیں ۔ رمزی کی حالت قابلِ رحم تھی ۔ وہ مجھ سے آنکھیں چار کرتے بھی گھبراتے یہ کہتے ہوئے دُردانہ سخت بیقرار ہو رہی تھیں ۔ اُن کی نرگسی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور کانپتے ہوئے لب دہر کی ستم ظریفی کا صحیح مرقع ۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس پُر درد تمہید نے انھیں عرقابِ الم کر دیا ہے ۔ بہر حال وہ کچھ دیر سکون کے بعد بولیں ۔

(۵)

آسماں دیتا ہے ہم کو رنج اوروں کو خوشی

واہ کیا کہنا ہے کیا کہتے ہیں اس تقدیر کو

جوں توں کر کے رمزی ایم اے ہو ہی گئے لیکن کس طرح ۔ آہ

اپنے خون کا آخری قطرہ بھی انھوں نے حصولِ ضروریات کیلئے نچوڑ دیا تھا کئی جگہ محض چند روپوں کے لیے ٹیوشن پر پڑھاتے ۔ ملازمت کی سر توڑ کوششیں اب بھی جاری تھیں پیہم تفکرات اور گرتی ہوئی صحت نے رمزی کو وہ رمزی نہیں چھوڑا تھا ۔ اب ایک سڈول جسم خوبصورت نوجوان کی جگہ ہڈیوں کا ڈھانچ رہ گیا تھا ۔ گردشِ آفاق کا شاکی اور میرے مستقبل کی فکر سے لرزاں

لیکن نہیں ۔ آسمان کے ترکش میں ابھی کچھ تیر اور باقی تھے جن کا شکار صرف رمزی کو اور مجھے ہونا تھا " اے کاش! اب بھی میرے اعماقِ قلب کی والہانہ آہ پکارتی ہے "کاش!! اس سرمایہ پرست دنیا کی آغوش میں غربت جنم نہ دیا کرے اور اگر لیتی ہی ہے تو عہد طفلی میں گھٹ کر رہ جائے نہیں تو یہاں کا زہریلا ماحول اُسے دایم المرض اور جینے سے بیزار کر دے گا اُسے خون غلطیدہ اور بازو شکستہ کرنے پر بھی اُسے چین نہیں آئے گا ۔

آہ! بہار کی وہ شام میں کبھی نہیں بھول سکتی جب کائنات پر قوس قزح کی تی رنگینیاں چھا رہی تھیں اور آفتابی شعاعیں سلسلہ ہائے کوہ پر الوداعی نگاہیں ڈال رہی تھیں لیکن مجھے تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ دہر پر تاریکیوں کا پردہ پڑ چکا ہے ۔ کسی ہیولائی تصوّر کی طرح عنصر ثانی

سایۂ فضا میں رقصاں ہیں اور خوفناک شیطانی قہقہوں میں کوئی میری
دیوانگی پر اظہارِ مسرّت کر رہا ہے

رمزی! میری آرزوؤں کا مرکز!! میری روح کی تصویر رمزی
صاحب فراش ہو چکا تھا۔ آہ! انجام وہی تھا جو غلاموں کی بستی میں رہنے
والوں کا ہوتا ہے یعنی دق۔ قلب و جگر کو جونک بن کر چوس لینے
والی خوفناک دق

خون پانی ایک کر کے بھی رمزی دنیا میں پنپ نہ سکے اور پنپتے
بھی کیونکر جب کہ غربت کی لرزتی ہوئی زندگی کا تانا بانا سرمایہ داری
کے مضبوط ہاتھ بُن رہے تھے

"رمزی! میں نے وفورِ غم سے بیقرار ہو کر کہا" میرے رمزی
میرا حشر تمہارے بعد کیا ہوگا؟" اِن الفاظ نے جادو کا سا اثر دکھایا
نیم بیہوشی سے رمزی گویا کچھ کچھ ہوش میں آئے انھوں نے دھیرے
دھیرے آنکھیں کھولیں جن پر فرشتۂ فنا کا عکس چھا رہا تھا اور ستار کے
مضراب زدہ تاروں کی طرح مرتعش آواز میں جواب دیا " گھبراؤ نہیں
ڈرو نہیں دُردانہ!! ہم بہت جلد ملیں گے۔ ہمارا وہ اتصال "دائمی"
ہوگا جہاں نہ دنیا کی الجھنیں ہونگی نہ شورشہائے حیات"

میں نے اُن کی ہلدی کی سی زرد آنکھوں پر لب رکھ دئے

جن سے دو نمناک آنسو پیوستہ ہوگئے۔ یہ تھا ہمارا پیمانِ جاوداں"۔
یہی وجہ ہے کہ میں دم بھر کے لئے رمزی کی قبر سے علیحدہ نہیں ہوتی۔ اُن کا
کہنا ضرور پورا ہوگا۔ کہیں اُن کی روح کو میری تلاش میں سرگرداں نہ ہونا
پڑے۔ اس خیال سے یہاں کی ایک لمحہ علحدگی بھی مجھ پر شاق ہے"
بس یہی ہے میری داستانِ حیات۔ رازدار بہن! دُردانہ
ایک سرد آہ بھر کر بولیں اور پُریاس و مظلوم نگاہوں سے مجھے تکنے لگیں
جس کا احساس مجھے تب ہوا جب پلکوں پر ٹھیرے ہوئے آنسو میری
آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے
دردانہ تو دم بخود تھیں لیکن ہوا کیکر کے درختوں میں
اُلجھ اُلجھ کر آہ و بکا کر رہی تھی اور فضا میں اُلّو چیخیں مار رہے تھے۔

(۶)

سکوں نصیب ہوا۔ اضطراب ختم ہوا
کتابِ زیست کا پُرکیف باب ختم ہوا

"رازبہن! آج میں مسرور ہوں۔ اتنی مسرور! کہ دولتِ کائنات
بھی اس کا نعم البدل نہیں ہوسکتی"
"دُردانہ پیاری! خدا تمھیں سکونِ قلبی عطا فرمائے خیریت باشد
یہ خوشی بھی مجھے کچھ خالی از علت نظر نہیں آتی"۔

"کاش انم میرے دلی جذبات کا اندازہ لگا سکتیں راز!" دُردانہ بچّوں کے سے لہجے میں بولیں "روزی ابھی ابھی میرے پاس تھے بہت جلد بلا لینے کا وعدہ کر گئے ہیں"

مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ زمین و آسمان ایک مرکز پر ٹھہر گئے ہیں دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا اور روح خاکستر

"آہ دردانہ! ایسے الفاظ کہنے سے پیشتر یہ تو سوچ لیا کرو کہ تمھاری بدنصیب بہن پر اس کا کیا اثر ہوگا"

"پیاری راز! مقدس دادر! تمھیں دنیا میں شاد و مسرور رکھنے میرے لئے اس قدر افسردہ نہ ہو یقین مانو کہ دہر سے کنارہ کش ہو کر بھی میں تم سے منہ نہیں موڑونگی"

"بہن! دردانہ بہن!!" میں نے دہشت سے کانپ کر کہا "ایسے جملے سننے کی مجھ میں تاب نہیں" اور اداس اداس نگاہوں سے اُفق کی طرف دیکھنے لگی - جہاں سیاہ سیاہ بادل جمع ہو رہے تھے اور کچھ کچھ اندھیری سی چھانے لگی تھی -

"دردانہ! میں نے انھیں مخاطب کر کے کہا" آج تک میری کوئی التجا تم نے قبول نہیں کی لیکن آج موسم کو اس طرح بگڑتے ہوئے دیکھ کر اگر التماس کروں کہ یہ شب اس بھیانک ماحول کی بجائے

بجائے میرے ساتھ گزارو تو انکار کر کے مجھے نا اُمید نہ کرنا معبود کے لئے میری پہلی اور آخری خواہش پوری کردو"

"ناممکن! میری راز!! یہ ناممکن ہے۔ آج رات تو مجھے رمزی کی معیت میں گزارنی ہے اور مجھے یقین ہے کہ شب ہماری "شب ملاقات ہے۔ نہیں! نہیں نہیں!! مجبور نہ کرو۔ تمہارے اصرار سے مجھے رنج ہوتا ہے"

یہ سوچ کر کہ میرے تکرار سے اُن کی دیوانگی عود نہ کر آئے مجھے خاموش ہو جانا پڑا لیکن دل کیلے کے نوخیز پتے کی طرح ہل رہا تھا دردانہ آج غیر معمولی طور پر مہربان تھیں اور باتیں بھی اچھی طرح کر رہی تھیں لیکن میں خود بخود سہمی جا رہی تھی۔ شب تاریک اور دُردانہ کی موجودگی کے تصور سے وقت مقررہ پر میں دُردانہ سے رخصت ہوئی۔ اُن کے نازک لبوں پر ایک لازوال تبسم کھیل رہا تھا جس نے مجھے مبہوت کر دیا اور دل ہی دل میں اُن کی سلامتی کی دعا مانگتی گھر واپس آئی

صدائے برق و رعد، رات کی آمد کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ فضا پر خوفناک تاریکی چھا رہی تھی اور کوئی نامعلوم سا دلو زان جو کائنات کو جھنجھوڑ رہا تھا۔

میں نے دریچے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ بادل زخمی شیروں کی طرح دھاڑ رہے تھے اور بجلی خون کی پیاسی تلوار کی طرح اُن کے پردوں میں تڑپ رہی تھی

کسی نامعلوم سے جذبے نے مجھے دُردانہ کی سلامتی کے لئے بیقرار کر دیا۔ اس قدر زیادہ کہ باوجود کوئی واہمہ سمجھ کر دل کو تسلی دینے کے بھی میری اُلجھن بڑھتی گئی اور ملازم کو فوراً لمپ ساتھ لانے کا اشارہ کرکے طوفانِ باراں کی پروا نہ کرتے ہوئے گورستان کی طرف روانہ ہوگئی

بادل کی قیامت خیز کڑک اور بارش کی مسلسل ٹپ ٹپ مجھے دُردانہ کے خطرے میں ہونے کا اشارہ کر رہی تھی اور آہوئے وحشت زدہ کی سی تیزی سے میرے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ یکایک بجلی چمکی اور اُس کی روشنی میں دردانہ کا سایہ کسی غیر مرئی روح کی طرح نظر آیا

"دُردانہ!" میں نے ہوش و حواس مجتمع کرتے ہوئے چیخ کر کہا "دردانہ!!"۔ اس کا جواب ایک ہولناک صوت تھی جس نے کچھ دیر کے لئے فضا کو درخشاں کر دیا

"رمزی" ایک خفیف سی آواز اُس کی بازگشت بن کر

گونجی اور پھر خاموشی! کامل خاموشی!!

کئی گھنٹوں کی مسلسل بیہوشی کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو صبح کا درخشاں آفتاب، بادلوں کے جھرمٹا میں سے جھانک رہا تھا اور دھلی دھلائی کائنات اپنے نئے روپ میں مسکرا رہی تھی

"دُردانہ کا کیا ہوا؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پہلا سوال کیا اور رات والے ہیبت ناک منظر کے تصور سے بے اختیار کانپ اٹھی

آہ! میرے بدترین اندیشے پورے ہو چکے تھے چند بوسیدہ سی ہڈیوں کے ساتھ تازہ مگر سوختہ استخواں پائے گئے تھے جنھیں یکجا دفن کر دیا گیا۔ یہ تھا مختصر سا جواب جو میرے سخت اصرار پر دیا گیا

ز فری اپنا پیمان "اتصال دائمی" پورا کر چکے تھے اور پیکر وفا دُردانہ مجھے وقف الم چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آسمانی بلندیوں پر پہنچ چکی تھی۔

———— ・:・ ————

آخری ہچکی

تکرار کیا ہے زندگی مستعار میں ؎ اے موت بار بار تقاضا نہ چاہیئے

فلاکت زدہ جھونپڑی کے ٹوٹے ہوئے کواڑوں سے تاریکی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ بستر مرگ پر لیٹی ہوئی دوشیزہ کی آنکھیں عزرائیل کے زہر آلود سانسوں سے ملوث تھیں اور وہ مرجھائے ہوئے کنول کی طرح ایک ایسی روح نظر آ رہی تھی جو غیر مرئی وادیوں سے پرواز کر کے کسی شوق تجسّس میں فانی دہر پر اُتر آئی ہو اور اب راستہ بھول کر گھبرائی ہوئی نظروں سے ہر اجنبی شئے کو تک رہی ہو۔ اُس کا چھوٹا بھائی کریم قریب ہی فرش پر بیٹھا پنکھا جھل رہا تھا وہ اپنی عزیز بہن کے پژمردہ چہرہ پر ملک الموت کا عکس دیکھ کر ہراساں تھا اور پلکوں پر ٹھیرے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف

"بھیّا" شدت درد سے کراہتے ہوئے بکلیں صفیہ نے کہا

"امی کیا ابھی تک خانصاحب کے ہاں سے واپس نہیں آئیں" بھائی کی ڈبڈبائی آنکھوں میں نمی دیکھ کر اشارتاً انہیں بیگم صاحبہ سے کچھ

ملنے کی اُمید ہوگی جو اَب تک ٹھہر گئیں۔ سردی سے میرا بند بند کانپ رہا ہے۔ ذرا لحاف اچھی طرح سے اُڑھا دو"

کریم نے آنسو پونچھ کر بہن کے حکم کی تعمیل کی اور کثیف لحاف جس کا جوڑ جوڑ علیحدہ ہو چکا تھا صفیہ کے ٹھٹھرتے ہوئے جسم پر ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ کہنہ و بوسیدہ لحاف! آہ!! اُس سے ماضی کی کتنی کہانیاں وابستہ تھیں۔ تقریباً آدھی صدی سے وہ اس مختصر سے خاندان کا حق رفاقت ادا کرتا آیا تھا۔ صفیہ کا باپ اور اُس سے پہلے دادا بھی اپنے مختصر عرصۂ حیات میں اضمحلال سے پُر روحوں کے سکون کی خاطر اسی کی آغوش میں کروٹیں لیا کرتے تھے اور کئی ننھے ننھے بلکتے بچے بھوک سے نڈھال اسے اوڑھ کر اُن وادیوں کی سیر کر چکے تھے جہاں فرشتے چہچہاتے ہیں اور لوکریاں بھر بھر کر اشیائے خورد و نوش نچھاور کیا کرتے ہیں۔

(۲)

رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

"بیگم! اچھی بیگم!! للہ میرے حالِ زار پر رحم فرمائیے میری بدنصیب بچی دوا کے ایک ایک گھونٹ کو ترس رہی ہے۔ اس کے مایوس

کان ہر اک قدم پر کسی حکیم یا ڈاکٹر کے منتظر رہتے ہیں جو اُسے زندگی کا رس عطا کر دے۔ آپ کی چھوٹی صاحبزادیوں کا واسطہ، میری بن باپ کی بچی کی حالت پر ترس کھائیے اور اپنی اولاد کا صدقہ سمجھ کر ہی بقایا تین روپے ادا کر دیجئے"

"آخر یہ بلا وجہ بکواس کیوں شروع کر رکھی ہے" بیگم صدیقی رعونت سے بولیں" ایک مرتبہ تم سے کہہ تو دیا کہ اس وقت میں اپنے کام میں مشغول ہوں۔ تمھاری باتوں کے لئے میرے پاس فالتو وقت نہیں پھر بار بار پریشان کرنے سے کیا فائدہ"

"بیگم! اس ممتا کے طفیل میں جو آپ کو اپنے بچوں سے ہے میرے جذبۂ مادری کا احساس فرمائیے۔ راتوں کی نیند اور دنوں کا سکون حرام کر کے ہم دونوں نے چھوٹی بیگموں کے جوڑے تیار کئے ہیں علالت پر اور بھی مشقت صفیہ کے لئے زہر قاتل ثابت ہوئی۔ اس کی رہی سہی طاقت خون بن بن کر آنکھوں کے راستے نکلی تھی تب کہیں جا کر جوڑے تیار ہوئے ہیں آپ سے قرض یا مفت نہیں مانگتی صرف اپنا حق الخدمت چاہتی ہوں۔ سلائی کی بقایا رقم رحم کر کے دے دیجئے۔ میرا رواں رواں آپ کو دعائے خیر دیگا"

"کوئی ہے جو اس بھیک منگی زبان دراز بڑھیا کو باہر کا راستہ

دکھائے۔ کمبخت نے ریڈیو سننے کا لطف ہی منغض کر دیا۔ ایسا عمدہ گانا ہو رہا تھا۔ غفور! آخر تم لوگ ہر کس و ناکس کو دروازے پر روکتے کیوں نہیں"

"معاف فرمائیے گا سرکار! غلام چھوٹے صاحبزادے کو اسکول پہنچانے گیا تھا" کہتے ہوئے غفور نے بد قسمت ضعیفہ کو باہر کی جانب دھکیلا صدیقی صاحب کا بلڈاگ بھی اُسے دیکھ کر پہلے تو بھونکتا ہوا آگے بڑھا لیکن شاید انسانیت کے اس سلوکِ حیوانیت پر اُسے بھی غیرت آگئی اور وہ پھاٹک ہی سے واپس مڑ آیا

(۳)

عنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی
دوام کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا

ستارے درختوں کے عقب سے آشکارا و نہاں ہو رہے تھے اور اپنی پوری تابانیوں سے درخشاں ماہتاب اُن کے جھرمٹ میں فرو کش تھا۔ عابدہ خرد و ہوش سے بے بہرہ ہو کر ایک مجنونانہ عالم میں قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ اُس کے تصورات پر صرف ایک حسرت کا پردہ چھا رہا تھا اور تھکی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان لہریں مار رہا تھا صفیہ کا زرد اور حسین چہرہ جو زبانِ حال سے چلا چلا کر کہتا کہ مجھے محض مفلسی

کے جرم میں موت گھسیٹے لئے جا رہی ہے۔ اس کے خونخوار منہ سے مجھے بچاؤ۔ دنیا ایک کھلتا ہوا پھول ہے لیکن عالمِ شباب میں مجھے اس سے علیحدہ کیا جا رہا ہے۔ اسے سونگھنے سے پہلے ہی کارکن قضا و قدر جدائی کی وسیع خلیج حائل کر رہا ہے"

عابدہ نے اضطراری طور پر آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی ایک سیاہ بادل نے نہ معلوم کہاں سے نمودار ہو کر شب ماہ کو کچھ دیر کے لئے روپوش کر دیا تھا

عابدہ کا تڑپتا ہوا دل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سینہ سے باہر آ رہے گا۔ طرح طرح کے توہمات اور وسوسے اسے بیقرار کرنے لگے اور سیاہ گھٹاؤں کی طرح اداس آنکھوں سے ایک سیلاب اشک جاری ہو گیا۔ وہ اشک! جس کا ایک ایک قطرہ دولتِ کائنات سے بڑھکر قیمتی ہے۔

(۴)

وہ نشاطِ زندگی جس پر بشر کو ناز ہے
رنج کی اک آخری ہچکی میں اس کا راز ہے

سامنے ہی جھونپڑی کے ٹوٹے ہوئے کواڑ کسی دیو کے لٹکے ہوئے کانوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ عابدہ نے کپکپاتے

ہوئے ہاتھوں سے تار تار پردہ سرکایا۔ صفیہ کا نرم و نازک جسم شدت کی سردی سے اس طرح کانپ رہا تھا جیسے گلاب کی کلی پہ قطرۂ شبنم لرزاں ہو۔

ہوائے شوریدہ کے جھونکوں سے دروازے زور زور سے ہلنے لگے۔ عابدہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے فرشتۂ موت دستک دے رہا ہے۔ کریم روتا روتا فرش پر سو چکا تھا۔ قدموں کی آہٹ سُن کر صفیہ نے اپنی نرگسی آنکھوں کو جنھیں فنا ابھی ابھی بوسہ دینے والی تھی۔ زبردستی کھولنے کی کوشش کی۔ اس کے یاقوتی ہونٹ جو اب برف سے بھی زیادہ سرد تھے، ہلے اور اس آواز میں جو دُور، اجل کی پہاڑیوں کے پار سے آتی معلوم ہوتی تھی کہنا شروع کیا

"امّی! پیاری امّی!! آپ آگئیں۔ اب میں اکیلی نہیں جان دوں گی۔ اس زہریلے ماحول اور پریشان فضا میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ زیست کا آتشکدہ سُلگ چکا ہے۔ اُس نے میرا جسم ہی نہیں بلکہ روح بھی جلا کر خاکستر کر دی تھی۔ بہرحال مسرور ہوں کہ انجام قریب ہے آہ! روئیے نہیں امّی جان! آپکی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے نزع سے بھی زیادہ تکلیف ہو رہی ہے۔ لیجئے خدا حافظ! ربالعرش کریم کو آپ کا دل بہلانے کے لئے سلامت رکھے"

اس کے بعد ایک ہچکی ...... آخری ہچکی، حیات کی
سرحد سے جدا کر کے آغوشِ فنا میں دینے والی ہچکی آئی اور عابدہ
کے وسوسے جامۂ حقیقت پہن چکے تھے

چاند اب بادلوں کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا لیکن
عابدہ کی زندگی اور روح کے چاند کو اس لئے روپوش ہونا پڑا کہ
کہ وہ آغوشِ غربت میں طلوع ہوا تھا۔ اس کی بیچارگی کا ہم آواز
ایک ننھا سا پرندہ تھا جس کی غمگین راگنی سے فضا اور بھی وحشت
ناک ہو رہی تھی۔ کانپتے ہوئے درختوں کے سائے ایسے معلوم
ہوتے تھے جیسے مفلسی کی تیرگی پر سرنگوں ہوں

اور! اوپر محفلِ انجم میں اس بات پر غور و خوض
ہو رہا تھا کہ فطرتِ انسانی کہاں تک "وقف صدائے زر" ہو چکی
ہے۔ غربت کے ٹوٹے ہوئے کشکول اس کی جھنکار سے نا آشنا
کیوں رہتے ہیں۔

زود پشیماں

بہار کی اُس چمکیلی سی شام کو جب شفق ارغوانی لباس میں ملبوس تھی اور نیلی نیلی دھوپ سرسبز و شاداب پتّوں پر رقصاں تھی سہ پہر کا سورج بادلوں کو قرمزی، روپہلی اور سنہری رنگوں میں رنگ رہا تھا

میں تعجب، رنج، حیرت اور یاس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ راحت منزل میں داخل ہوئی۔ نواب راحت علی کے انتقال اور اُن کی اکلوتی لڑکی ریحانہ خانم کے سلسلۂ ازدواج میں منسلک ہو جانے کے بعد آج میرا یہاں آنے کا پہلا موقع تھا، اس پر مستزاد یہ کہ اپنی عزیز ترین دوست کے بستر مرگ پر

میں خاموشی سے کمرۂ علالت میں داخل ہوئی جس کے ماحول کو فضا پر منڈلاتی ہوئی دھندلی دھندلی پرچھائیاں اور بھی اُداس بنا رہی تھیں جیسے ذرّہ ذرّہ گریہ کناں اور نوحہ گر ہو سامنے ہی سفید شال میں لپٹی لپٹائی، زندگی اور موت سے جدوجہد کرتی ہوئی ریحانہ لیٹی ہوئی تھی کسی یونانی اصنام گر کے مجسمہ کی طرح ساکت

اور اپنے پہلے وجود کا عکس محض
ہاں! یہ ریحانہ ہی تھی۔ فطرت کی بہترین نقاشی اور سوسائٹی کی ایک درخشاں فرد۔ لیکن آہ! یہ تو اُس وقت کا ذکر ہے جب اُس کے آئینۂ تقدیر کو وقت کے کرخت ہاتھوں نے گرد آلود نہیں کیا تھا
آپ نے انگور کی بیل کو ہوا کے سرد جھونکوں سے جنباں تو دیکھا ہی ہوگا بالکل اسی طرح! زندگی کی دم توڑتی ہوئی لہریں اور موت کے آگے بڑھتے چھینٹے ریحانہ کو لرزا رہے تھے اپنی چہیتی دوست کو اس حالت میں دیکھ کر میری روح لرز اُٹھی اور میں ایک عالمِ یاس میں، پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر فطرت کے اس بدلتے ہوئے مرقع کو دیکھنے لگی
ان خوبصورت نرگسی آنکھوں کے گرد جن پر ریحانہ کو کبھی ناز تھا گہرے گہرے سیاہ حلقے چھا رہے تھے۔ شدتِ گریہ کی وجہ سے اُن کی تمام دلکشی کھوئی جا چکی تھی اور اُلجھے ہوئے گیسو زرد زرد زندگی سے عاری رخسار نہ معلوم کونسی دنیا کا منظر پیش کر رہے تھے
"ریحانہ! میری مظلوم بہن!! تم اور اس حالت میں"
میں شدتِ غم سے مغلوب ہو کر چلّا اُٹھی اور ایک عالمِ بیچارگی

میں اُس کے تپ زدہ نازک سے ہاتھ کو تھام لیا

دھیرے دھیرے وہ بیمار آنکھیں کھلیں اور اپنی پوری قوت سے مجھ پر مجتمع ہو کر رہ گئیں اور پھر نحیف و باریک سرگوشیوں کے سے لہجے میں ریحانہ گویا ہوئیں "راز! تم آگئیں؟ مجھے قوی اُمید تھی کہ تم ضرور آؤ گی اور مجھے دمِ واپسیں ...."

"آئی کیونکر نہ" میں نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی خاطر قطع کلام کرتے ہوئے کہا "لیکن ریحانہ! یہ حالت کب سے ہے؟ کبھی خط کے ذریعہ ہی اپنی حالت کی اطلاع دے دیتیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم اس کس مپرسی کی حالت میں ہوگی صرف اس خیال سے کہ تمھیں دیکھے مدت گزر چکی تھی تار موصول ہوتے ہی چل پڑی۔ یقین تھا کہ تمھیں ازدواجی زندگی کی پُر مسرت گھڑیاں گزارتے دیکھوں گی لیکن یہاں تو معاملہ ہی برعکس نظر آرہا ہے"

"آہ راز! تمھیں زمانے کا اندازہ نہیں ہے" ریحانہ نے نقاہت سے جواب دیا "تمھیں کیا معلوم ؎

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

بیشک میں نے اپنے غم انگیز واقعات تم سے پوشیدہ رکھے لیکن میری بہن! وہ کسی خاص وجہ سے نہیں بلکہ محض اس لئے کہ تم یوں بھی بیحد حساس لڑکی ہو۔ میری المناک داستان سنکر اور بھی رنجیدہ ہوگی اس لئے غالباً میری حسرت انگیز زندگی کا یہ باب میرے ساتھ ہی دفن ہوجاتا اگر مجھے فرخانہ کے مستقبل کا خیال نہ ہوتا لیکن اب میں صرف اپنی بچّی ہی اطمینان سے تمھارے ہاتھوں میں نہیں دونگی بلکہ اپنی داستانِ حیات کا یہ دوسالہ ورق بھی سناؤنگی ممکن ہے اس سے مجھ جیسی مظلوم بہنوں کو کچھ فائدہ پہنچ سکے"

"میں ہمہ تن گوش ہوں" میں نے ریحانہ کی سڈول کلائی کو جو اب محض ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی اپنے ہاتھ میں لے کر کہا

"یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے" ریحانہ نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا" میں بچپن ہی سے اپنے خالہ زاد بھائی مختار سے منسوب تھی۔ ماں باپ کا اکلوتا فرزند ہونے کی وجہ سے وہ جس قدر بھی بگڑ جاتے کم تھا۔ ابّا جان مرحوم نے بہتیری کوشش کی کہ یا تو مختار ہی راہِ راست پر آجائیں یا یہ نسبت ہی چھڑالی جائے لیکن اُن کی یہ سعی، سعیٔ ناکام سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی کیونکہ امّاں جان کی نظروں میں تو اُن سے زیادہ نیک اور فرمانبردار لڑکا ہی کوئی

نہ تھا۔ اُن کی خطاؤں اور بگڑے ہوئے طور طریق کو بچپن کی شوخیاں کہکر نظر انداز کر دیتیں اور اُن کے ہر عیب کو نا سمجھی سمجھ کر چشم پوشی کرنا تو اَمّاں جان کا شروع ہی سے معمول تھا

آخر وہ دن بھی آیا کہ میرے پیارے ابّا جان نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا اور امّی جان کو اپنی دلی حسرت پوری کرنیکا موقع ملا"

یہ کہتے کہتے ریحانہ کی آواز بالکل بھرّا چکی تھی چنانچہ کچھ سکوت کے بعد بولیں "پیاری راز! ایک گلاس پانی کا پلا دو تاکہ میں سلسلۂ کلام جاری رکھ سکوں میرا گلا تو ابھی سے خشک ہو رہا ہے"

مجھے معلوم تھا کہ اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں اور ہیجان جذبات کو قابو میں رکھنے کے لئے ریحانہ پانی طلب کر رہی ہیں لیکن اس کے سوا کر ہی کیا سکتی تھی کہ پارہ آہ کو خامشی میں جذب کرتے ہوئے پانی دوں

"آہ! پیاری راز!! اب اگر میں یہ کہوں کہ "کلیجہ تھام لو گی جب سنو گی داستاں میری" — پانی پی کر ریحانہ بولیں تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ میرا زندہ جنازہ۔ امّی جان کی چند روزہ خوشی پوری کرنے کے لئے مختار صاحب کے گھر آ ہی گیا۔ انھوں نے چند روز تو جیسا کہ اس سرشت کے نوجوانوں کا خاصّہ ہے، بعد الفت

جتائی لیکن آخر وہی ہو کر رہا جس کا مجھے شروع ہی سے ڈر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی اصلیت پر آنا شروع ہوئے اور شادی کے سال بھر بعد ہی مختار صاحب اپنی رہی سہی جائداد بھی بازارِ حسن کی بارگاہ میں بھینٹ چڑھا چکے تھے رفتہ رفتہ گھر کے بقیہ سامان کے ساتھ میرے زیورات کی بھی نوبت آئی۔ سو وہ بھی مختار صاحب کبھی ڈرا دھمکا کر اور کبھی بہلا پھسلا کر شاہدانِ بازاری کی زیبائشِ حسن کے لئے لے گئے

یہ صدمات کیا کم روح فرسا تھے کہ مختار صاحب نے گھر پر آنا بالکل ہی چھوڑ دیا۔ میں پہروں غلطاں و پیچاں اُن کی منتظر رہتی لیکن بے سود جس جال میں وہ پھنس چکے تھے اُس کی بندش کچھ ایسی ڈھیلی نہیں تھی کہ وہ کبھی پیچھا چھڑا سکیں۔ آہ پیاری راز! یوں تو ہمارے اس بدبخت ملک میں ہزاروں ایسی روحیں جنم لیتی ہیں کہ چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لو سے بھی بے نیاز۔ اپنے اُفقِ تقدیر پر چھائی ہوئی تاریکی میں ہی دم دے دیں گھر کا چراغ کہلانے پر بھی اُنھیں روشنی کی ایک کرن میسر نہیں ہوتی

لیکن میری فرخانہ نے ایسے وقت حیاتِ فانی کا پہلا سانس لیا جب گھر میں دوا دارو کے لئے پیسہ تو کیا ہونا تھا

انسان کا نام تک مفقود تھا
"کاش! کہ ہم دونوں بدنصیب اس عالم میں اور رہ کے دیکھتیں"
تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی لیکن افسوس کہ اماں جان کسی قدر احساس
مادری سے مغلوب، وہاں وقت پر پہنچ گئیں اور میری حالت روز بروز
گرتے دیکھ کر مجھے راحت منزل میں اٹھا لائیں جہاں ابا جان کی زندگی
میں ہر لمحہ لمحۂ حیات سے کم نہ تھا لیکن اب! آہ!! اب تو۔

سو بیٹے کھائے زلف نے پر دل کا رنج خوشی نہ بنا
کیا موت کی نیند میں ہے قسمت جو ایک ہی کروٹ سو گئی

مختار صاحب نے اس دوران میں ایک نیا گل کھلایا۔ کسی
بی صاحبہ کے دو شیدائیوں کے ساتھ مل کر ایک شخص پر قاتلانہ حملہ کیا
ان میں سے ایک تو سرکاری گواہ بن گیا اور یہ مع اپنے ساتھی کے دو سال
قید سخت کی سزا بھگت رہے ہیں۔ یہ کتنی غنیمت ہے کہ مجروح زیادہ
زخمی نہیں ہوا تھا ورنہ انھیں اپنی جانوں ہی کے لالے پڑ جاتے
یہ ہم لفنگیاں تھا اور ہر وقت کی کوفت مجھے گھن کی طرح کھائے گئی۔ کیا
بتاؤں آپا! کہ کس قدر مسرت و اطمینان مجھے ڈاکٹر صاحب سے
یہ سن کر ہوا ہے کہ مرض لاعلاج ہو چکا ہے اور اب نہ دوا
کام آ سکتی ہے نہ دعا۔

میں یہ سُن کر دامنِ صبر و قرار ہاتھ سے چھوڑ چکی تھی اور قریب تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں لیکن ریحانہ انداز دلبری سے گویا ہوئیں ؂

زندگانی کی تھی بیہودہ تمنائے نشاط
عمرِ دوروزہ کی گویا ہوس خام تھی میں

میری رازدار! کیا یہ امر تمہارے لئے باعثِ خوشی نہ ہوگا کہ میں اُس دنیا کی طرف پرواز کناں ہوں جہاں عشرتِ جاودانی ہے۔ اس پُر از فریب اور مخزنِ مصائب دنیا کا مقابلہ کرتے کرتے تو میری قوتِ برداشت سلب ہو چکی ہے ہاں ایک حسرت ہے آخری آرزو۔ وہ یہ کہ مختار صاحب کی رہائی کے دن قریب ہیں کاش! آخری مرتبہ انھیں دیکھ سکتی پھر سکون کے ساتھ جان، جانِ آفریں کے حوالہ کرنے میں مجھے کچھ عذر نہ ہوگا

وفا کی پُتلی ریحانہ سے یہ الفاظ سُن کر میں نقشِ حیرت ہو گئی۔ جس شخص نے اُس کے حسن اور جوانی کو خاک میں ملا دیا ہر ممکن طریقے سے کچل دیا۔ قریب قریب برباد کر دیا اور اب جان لے رہا ہے اسے دیکھنے کی اس قدر تمنا کہ "دمِ واپسیں برسرِ راہ ہو"

میرے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے ریحانہ نے خیالات کا

اندازہ لگالیا۔ ایک حسرتناک مسکراہٹ سے بولیں "راز بہن! مجھے معلوم ہے جو جذبات اس وقت تمہارے دل میں موجزن ہیں لیکن یہ نہ بھولو کہ میں بھی ایک ہندوستانی لڑکی ہوں اور اپنے خدائے مجازی کی سلامتی کی ہر وقت متمنی۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ اگرچہ مختار صاحب اپنے کردار پر پشیمان نہیں تھے لیکن اب ضرور ہونگے اور ممکن ہے کہ میری یہ قربانی کچھ رنگ لائے یہی اُن کی کایا پلٹ کا باعث ہو"

"آمین" میں نے آہستہ سے کہا "لیکن یہ کایا پلٹ بعد از وقت ہوگی"

کون کہہ سکتا ہے کہ ریحانہ کے الفاظ بعید از صداقت تھے۔ دُکھے ہوئے معصوم دل کی فریاد سے تو عرش بھی ہل جاتا ہے ناممکن تھا کہ مختار پر کچھ اثر نہ ہوتا

میرے آنے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد ریحانہ نزع کی دلدوز کیفیت سے دوچار ہو رہی تھی۔ بیگم راحت اس کی دوائیاں جھاڑیں کھا رہی تھیں۔ فضا سرد آہوں کی طرح گیلی اور آلودہ سی نمناک تھی اور میں آنسوؤں کے زبردست طوفان میں نحیف داستان جدائی کا مطالعہ کر رہی تھی ایسی پُرخار جدائی ... کے لئے دو وابستہ ہستیوں کو ایک دوسرے سے

علیحدہ کر دیتی ہے

ایسے وقت میں جب بیگم بے بس اور مظلوم انسان
اشرف المخلوقات ہونے پر بھی موت کے زبردست ہاتھوں میں
کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔ عالم بیچارگی میں بیٹھے روحانی سکون کی دعا
مانگی جا رہی تھی کہ ایک شخص میلے کچیلے کپڑے پہنے پریشان حال
کمرے میں داخل ہوا اُس کے چہرے پر غم و اندوہ کے بادل چھا رہے
تھے اور ہر ہر حرکت سے ندامت نمایاں

یہ مختار تھا۔ اپنے کئے پر پشیمان اور معافی کا طالب آہ
ریحانہ غریب مر چکی تھی۔ میرے دل میں جذبات نفرت امنڈ آئے
اس ذلیل کمبخت انسان کا مادہ غیرت کہاں گیا؟ کیا مرتے دم بھی
ریحانہ کو اپنی ناپاک صورت دکھا کر پرانے زخم تازہ کرنے آیا ہے دوبارہ
موت کی اذیت سے دوچار کرائے گا۔ جی چاہتا تھا کہ چلا چلا کر اس سے
کہوں کہ بابا [illegible] یہ انسان یہ فرشتہ موت نہیں تھا جو اب ریحانہ
کی جان لینے آیا ہے۔ یہ تو تھا صرف تو جس نے آج تک دیمک
کی طرح چاٹ کے اور جونک کی طرح چوس کر اس [illegible] کا خون
جذب کیا ہے۔

لیکن اسی وقت مجھے ریحانہ کی آخری آرزو کا خیال آیا اور

بجائے مختار کی طرف متوجہ ہونے کے کسی غیر ارادی قوت سے
پلنگ پر جھک کر کہا "لو ریحانہ! آگئے ہیں تمہارے مختار صاحب
جنھیں دیکھنے کے لیے اس قدر بے قرار تھیں"

نہ معلوم ان الفاظ میں کیا جادو تھا کہ ریحانہ نے جھٹ
پتھرائی ہوئی آنکھیں کھول دیں۔ غالباً آخری مرتبہ مختار کو دیکھنے
کے لئے۔ اور دوسری دنیا سے آتی ہوئی آواز میں آہستہ آہستہ
کہا "بھیا راز! وہ پشیمان ہو کر آئے ہیں اور پھر مختار سے مخاطب ہو کر

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اور ریحانہ کی جگہ اس کا جسد خاکی دھرا تھا سیکڑوں تکالیف کا
شکار لیکن مختار کی اس زود پشیمانی پر مطمئن۔

قربانی

دنیا والوں کے لئے عید ہمیشہ عیش اور دیباچۂ مسرت بن کر آتی ہے لیکن اسی دنیا میں بہت سی ایسی زندگیاں بھی سانس لے رہی ہیں جن کے واسطے صباح عید صبح ملال سے کم نہیں اور تکالیف و مصائب کی وہ بھولی ہوئی آگ جسے امتداد زمانہ کچھ سکون پذیر کر چکا ہوتا ہے اس کی آمد کے ساتھ ہی ہری ہو کر ایسی درد بھری شعلہ بار مارنے لگتی ہے کہ سامان محشر بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتے

ان مفلس غریبوں اور بے بس انسانوں کے لئے جنھیں انسانیت انسان کا درجہ دینے سے بھی منکر ہے۔ شام عید شام غم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور صبح عید سحر ماتم بن کر آتی ہے

جب کائنات ہلال عید کی تابانیوں سے منور ہو رہی ہو تو ان میں سے کتنی ہی آنکھیں حیات کی تاریکیوں کی تاب نہ لا کر دم دے دیتی ہیں اور کتنی ہی نعرہ ہائے مسرت کی بجائے پارہ ہائے آہ سے اس کا استقبال کرتے ہوئے اس وقت کا انتظار کرتی ہیں جب فرشتہ موت کی انگلیوں کا مس ان کی تمام تکالیف کا ازالہ کر دے

نہ معلوم نواب غضنفر علی خاں کو اپنے موضع میں کیا خوبی نظر آئی کہ اُسے "عشرت آباد" کا خطاب دے دیا جب کہ وہاں کی ننانوے فیصدی آبادی کے لئے تو یہ لفظ ہی تشریح طلب تھا۔ اُن کے نیم برہنہ جسم شرمندۂ لباس نہ تھے۔ سوکھے ہوئے چہروں میں سے جھانکتی ہوئی پسلیاں گویا کہ زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں۔ کہ ہم لذتِ سیری کے نام سے واقف نہیں

اور گرتے ہوئے جھونپڑوں کی کمانیاں فریاد رس تھیں کہ الٰہی! بنو رہنے ہمیں مرمت نصیب نہیں۔ اس ماحول کو بھی اگر جنت قرار دیا جائے تو پھر دوزخ کس شے کا نام رکھا گیا ہے

معمول کی طرح امسال بھی عید قرباں آئی اور بڑے کر و فر سے آئی۔ کائنات پھر فردوسِ گوش اور بہشتی نغمے الاپنے لگی جیسے خوابوں کے جزیرے میں عشرت ہا و دانی کی بارش ہو رہی ہو ہر جہار جانب سے مسکراہٹوں اور خوشیوں کا طوفان اُٹھنے لگا جیسے کہ جنت بہشت میں سیلاب آ رہا ہے

نواب صاحب کے ہاں آج بڑے پیمانہ پر تیاریاں ہو رہی تھیں عید کی مسرت کیا کم تھی کہ خدا نے اس بار دولت کا جو غریبوں کا خون جونکوں کی طرح چوس چوس کر حاصل کی تھی وارث عطا کر کے اس خوشی

کو اور بھی دو بالا کر دیا

حکام بالا دعوتِ عید اور بچہ کے عقیقہ پر نواب صاحب کے ہاں مدعو تھے۔ اس سلسلہ میں "بیگار" میں پکڑے ہوئے مزدوروں کو حق ہی کیا تھا کہ وہ خود بھی عید منانے کا سوال زبان پر لا سکیں یہ کہنا مبالغہ سے قطعی مبرا ہو گا کہ وہاں کی آبادی سے زیادہ خوش نصیب قربانی کے وہ جانور تھے جنھیں انتہائی غور و خوض سے اس مقصد کیلئے پوری طرح تیار کیا گیا تھا

اس سے ہاں اس وقت جب نواب صاحب کے ہاں دعوت اڑائی جا رہی تھی اور دل کھول کر ان کی دریا دلی کی داد میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا رہے تھے اک بوسیدہ جھونپڑے میں ایک ننھی سی جان جسے امیر دنیا "نور دیدہ" اور "وارثِ جاہ و مال" کے نام سے موسوم کرتی ہے اور غریب "چراغ کاشانہ غربت" کہتے ہیں اپنی بدنصیب ماں کی گود میں سسکتے، تلملاتے اور کانپتے ہوئے دم توڑ رہی تھی بیکس ماں کے خونِ جگر کے قطرے آنسو بن بن کر آنکھوں کے راستے بہہ رہے تھے اور زندگی اس مرکز پر ٹھہرتی نظر آتی تھی جہاں ہر وقت حسرت و یاس کا غبار چھایا رہتا ہے اور ویرانیوں کے جھکڑ چلتے ہیں

بچے نے آخری سنبھالا لیا اور ابا۔ ابا کی رٹ لگا دی لیکن غریب بچہ، اس کی یہ خواہش پوری ہونے والی کہاں تھی۔ اس کا ابا تو

مفلس ہونے کے جرم میں نواب صاحب کی بارگاہ میں ماخوذ تھا اور
سیم وزر کی جھنکار میں اعماق قلب کی دردناک آہوں کو
جذب کرنے کی ناکام کوششوں میں مصروف

آج کئی روز سے مہاوٹ کی سردیوں سے اس کا غفور ڈبل
نمونیہ میں مبتلا تھا لیکن جب کھانے ہی کے لالے پڑے ہوں تو دوا
کہاں کی اور علاج کیسا! بیچارے مجید کو امید کی صرف ایک کرن
نظر آتی تھی وہ یہ کہ عید کے روز جب نواب صاحب بقایا جات
چکائیں گے تو اسے بھی دو روپے پچھلے چند ماہ کے رکے ہوئے مل جائینگے
اور اُن سے وہ اپنے غفور کا علاج حکیم جی سے پوری طرح کرائیگا

لیکن آہ! وہ شعاع اُمید بھی آج اُس شہاب ثاقب کی
طرح جو کائنات کی لامتناہی وسعتوں میں آخری جھلک دکھا کر
نظروں سے غائب ہو جائے بجھ چکی تھی کیونکہ صبح ہی صبح جب مہر
عالمتاب آسمانی گہرائیوں سے جھانک رہا تھا اور دنیا کو عید کی
خوشیوں سے سرشار ہوتے دیکھ کر خود بھی مدہوش تھا مجید نے
بچے کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر سہما جاتا تھا سیکڑوں خیالات
اُس کے دل میں موجزن ہوتے اور اڑتے ہوئے بگولے کی طرح
اس مرغزار میں پہنچ جاتے جہاں یاس و غم کا دور دورہ ہوتا ہے

اس عالم میں نہ معلوم کب تک مجید پڑا رہتا اگر نواب صاحب کا ملازم فرستادۂ قضا کی طرح بیگار میں حاضر ہونے کا پروانہ لے کر نہ آجاتا۔ مجید بہتیرا تڑپا۔ گڑگڑایا۔ شفقتِ پدری کے نام پر آہ و زاری کی اور رخصت ہونے والے ننھے مسافر کی حالتِ زار دکھائی لیکن بے سود۔ فولاد جیسے دل جنھیں رات دن ایسے واقعات سے دوچار ہونے کی عادت تھی کب پسیجنے والے تھے چنانچہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے بچے کی طرف دیکھا اور اپنی تقدیر پر گریہ کناں ملازم کے ساتھ ہو لیا

ختم ہونے والے دن نے رخصت عید کا گجر بجایا تو بیگار میں پکڑے ہوئے مزدوروں کو بھی واپس جانے کی اجازت ملی۔ مجید کے دل میں صرف ایک آرزو تھی اور وہ یہ کہ کسی طرح پر لگا کر بچہ کے پاس پہنچ جائے اور اسے سینے سے لگا کر اپنے تڑپتے ہوئے دل کو تسکین دے لیکن آج سورج نہ معلوم اسے اداس اداس کیوں دکھائی دیتا تھا۔ دھندلی شفق میں سرخ سرخ ٹکڑے تیرتے نظر آرہے تھے جیسے سیکڑوں آرزوؤں کا خون ہو رہا ہو اور ہر شے ایک غمناک لبادے میں ملبوس معلوم ہوتی جیسے چمنستانِ حیات کے کسی ننھے سے غنچہ پر آنسو ٹپک رہے ہوں

کہتے ہیں کہ فرشتہ اجل کی آغوش میں بچہ اور اُس کے
چنگل میں فرطِ غم سے بیہوش بیوی کو دیکھ کر مجید کا دماغی توازن
بگڑ گیا۔ اب بھی شب کے سناٹے کو کسی مجذوب کی بڑ توڑ
دیا کرتی ہے جو ستاروں کی کانپتی ہوئی تنویروں میں اپنے خواب
ہائے پریشاں کی تعبیر ڈھونڈا کرتا ہے اور دونوں قبروں کی مجاوری
کرتے کرتے اپنی ہی تابش تبسم پر برباد آرزوؤں کو رقصاں
دیکھ کر چونک اٹھتا ہے۔ اُس کی حالت غیر ہو جاتی ہے
اور مارے غصہ کے اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتے ہیں۔

اور! اور!! سرمایہ داروں کی بھینٹ چڑھی ہوئی
قربانیوں پر گلِ ریحان کی ڈالیاں اس طرح کانپا کرتی ہیں جیسے
کوئی دھیمے دھیمے سروں میں واماندگی کے نالے اور افلاس زدہ
روحوں کے مرثیے پڑھ رہا ہو۔

یہ اُن دنوں کا واقعہ ہے جب شہر کی شوریدہ اور آورد سے لبریز زندگی سے میں اُکتا گئی تھی اور کارزارِ حیات کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں سے وارفتہ خاطر، ایسے وقت میں کانگڑے کی خوشگوار وادی کا قیام متلاشیٔ سکون کے لئے حیات بخش تھا اور قدرت کی بوقلمونی باعثِ نشاط

لیکن بلند جذبہ ، جس باب کی تمہید ہنگامۂ تزئین و کامرانی تھی اُس کا انجام کیسا لرزہ خیز اور زمانہ کی شنعتِ مدینہ کے ہاتھوں مثالِ ظلم نکلا !! (م - ر)

(۱)

غروبِ آفتاب کی آخری کرن آغوشِ شام میں لڑکھڑا رہی تھی۔ شاہین نیلے نیلے آسمان کے خلا میں شکار کی تلاش کر رہے تھے اور ہلکی ہلکی دھند شمشاد و صنوبر پر سایہ فگن تھی۔ کائنات دن بھر کی تگ و دو کے بعد اطمینان کا سانس لے رہی تھی

ماحول کی کیف آفرینی نے میری نیچر پرست روح کو بے قرار

کر دیا اور اپنی میزبان خاتون کی ممانعت کے باوجود قریب کی
جوشیلی ندی کی بہار دیکھنے اور اُس کے سُریلے راگوں سے لطف اندوز
ہونے کے ارادے سے باہر نکل ہی گئی
تقریباً گھنٹہ بھر شوخ و شنگ موجوں کا رقص اور شمیم کے
جھونکوں سے جھومتی ہوئی شاخوں کا مشاہدہ کرتی رہی واپس ہونے
کا خیال بھی آیا تو اُس وقت! جب بادل ہلکے ہلکے گرج رہے تھے
کسی دیو کی غراہٹ کی طرح جو جھنجھلایا ہوا غیر مرئی وادیوں میں چکر
کاٹ رہا ہو۔ کپکپی طاری کر دینے والے سرد جھونکے دیباچۂ رحمت باری
تھے اور بر نہ آنے والی خواہشوں کی طرح اُمڈتے ہوئے بادل اُس کے
نزول کے لئے سرگرم
اِن پہاڑی علاقوں میں چشمک برق کی سی عارضی دھوپ
ہر بار دھوکا دیتی ہے میں فوری واپسی کے ارادے سے اُٹھی تاکہ بارش سے
پہلے پہلے اپنی جائے قیام پر پہنچ جاؤں لیکن ٹوٹی ہوئی مالا کے دانوں
کی طرح بوچھار شروع ہو گئی اور وہ بھی اس زور سے کہ میں دم
بھر میں شرابور ہو چکی تھی لیکن قیام گاہ" ابھی کافی دور تھا
ناچار اپنے شوقِ بے وقت کا گلہ کرتے ہوئے قریب کی
ایک جھونپڑی کی آڑ میں کھڑی ہو گئی اور برگِ کاہیدہ کی طرح

کانپتے ہوئے والپی کے متعلق غور کر رہی تھی کہ قریب ہی سے کسی کے بلانے کی آواز آئی۔ یہ آواز ایسی نرم و خلوص آمیز تھی کہ میں فوراً اپنی غیبی محسنہ کی طرف احسانمندانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ یہ ایک نوعمر "گدی" (ضلع کانگڑہ کے اصلی باشندے) خاتون تھیں۔ سراپا ایک سیاہ کپڑے میں ملبوس اور اپنے قومی امتیاز کو واضح کرتے ہوئے بالکل سادہ

ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں شکریہ ادا کر کے اُن کے ہمراہ اندر گئی اور جب دھوئیں سے بھرپور لیکن حالبس انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر کچھ حواس ٹھکانے پر آئے تو موسم کی نیرنگی سے لے کر ضلع کانگڑہ کی کیف آفرینی تک پر تبصرہ ہو گیا۔ یہ سن کر کہ میں عرصۂ تعطیلات گزارنے آئی ہوئی ہوں اور ابھی کچھ عرصہ یہیں قیام رہے گا۔ خاتون شہلا بہت مسرور ہوئیں اور اکثر ملتے رہنے کا وعدہ کیا

(۲)

شہلا کا تعلق پہاڑی قبیلے سے تھا۔ نام نہاد تہذیب و تمدن سے بیگانہ اور اپنے محدود ذرائع حیات پر شاکر جن کے لئے دنیاوی الجھنیں اور بڑھتی ہوئی شورشیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں اور نہ لوازمات دہر میں ان کے لئے کوئی قدر و قیمت ہے لیکن مجھے

فخر تھا کہ وطن سے دور ایسی ملنسار خاتون کی قربت نصیب ہوئی جس نے کچھ احساسِ غربت ہی نہ ہونے دیا وہ ایک پُر خلوص لڑکی تھیں اور صفاتِ اعلیٰ سے مزین

ان کے سیہ پوش ہونے کا راز بھی بہت جلد معلوم ہو گیا۔ تقریباً پانچ سال گزرے۔ اُن کا شوہر اکبر تلاشِ روزگار میں ترائی کی طرف چلا گیا تھا۔ قناعت پسند ہوتے ہوئے بھی وہ اس یکسانیت پر قانع نہ رہ سکا۔ شروع شروع میں تو چند ماہ خطوط اور کچھ روپے بھی موصول ہوتے رہے لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ یک لخت بند ہو گیا۔ شہلا جو محض چھ ماہ پیشتر ایک عروسِ نو بن کر آئی تھیں۔ اب ایک حسرت زدہ بیوی تھیں ہر سال اوائل سرما میں اُن کی اُمیدیں شگفتہ ہو جاتیں لیکن گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ مرہونِ یاس ہوتے گئے۔

اکبر کی پُر اسرار عدم موجودگی شہلا کے ایام خاموش اور مایوس بنا رہی تھی جیسے حسین چاند بادلوں کے گھیرے میں روپوش ہو گیا ہو۔

یہ اداس تسلسل نہ معلوم کب تک جاری رہتا کہ شہلا کی شعاعِ اُمید ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریک ہو گئی اور اُن کی زندگی

مضرابِ الم سے نکلی ہوئی جھنجھناہٹ بن کر رہ گئی۔ اکبر کا ہمسایہ جو اُس کے ہمراہ ہی حصولِ روزگار کے لئے روانہ ہوا تھا۔ اب کئی سال کے بعد واپس لوٹا اور خبر بھی لایا تو یہ کہ جس قافلہ میں اکبر تھا وہ چڑھائی کے وقت واپسی میں برفانی جھکڑوں کی تاب نہ لا کر لقمۂ اجل ہو گیا اکبر کا شمار بھی فرشتۂ موت کے شکار لوگوں میں تھا اس کے لئے وثوق کے ساتھ یہی کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ یہ گمشدگی و روپوشی چہ معنی دارد

(۱۴)

شہلا پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا۔ اِن کا قوی وجیہ شوہر جو آئندہ زندگی درخشاں بنانے کے لئے گیا تھا اب ہمیشہ کے لئے اُن کا مستقبل تاریک کر گیا۔ شہلا کی حالت دِگرگوں تھی ہر وہ شئے جس کا تعلق کبھی اکبر سے رہا تھا اُن کے لئے سرمایۂ حیات تھی۔ پہاڑی نالوں کے راگوں میں انھیں بھولی ہوئی کہانیاں سنائی دیتیں اور چاند کی سنہری کرنوں میں کھویا ہوا مطلوب پنہاں نظر آتا

گھر اور گھر والوں سے انھیں کوئی خاص واسطہ نہیں رہا تھا۔ ہاں اکبر کے برادرِ خورد اصغر سے اک تعلق قلبی تھا۔ ننھا اصغر بالکل بھائی کا ہمشکل تھا۔ اس کی ہی عادتیں اور ویسا ہی طرز و انداز۔ شہلا

اسے لمحہ بھر کے لئے بھی نگاہوں سے دور نہ ہونے دیتیں اسکی معمولی سی تکلیف پر بلبلا اٹھتیں اور پروانہ وار اس کی معصوم اداؤں پر نثار تھیں۔ یوں ہی یہ پُر صعوبت دن گزرتے جاتے۔

گاؤں والے اس شوخ اور چلبلی شہلا کو بھول چکے تھے جو ہر ایک کا مرکز نگاہ تھی اب وہاں ایک حزین اور غم زدہ ہستی تھی جس کا دکھ تمام لوگوں سے بڑھا ہوا تھا۔

کبھی کبھی اس تاریک دنیا میں روشنی کی ایک دھندلی سی کرن بھی نظر آجاتی جس سے شہلا کا حوادث زمانہ سے سرد دل جگمگا اٹھتا۔ یہ شعاع امید تھی جو یہ ظاہر کرتی کہ شاید اکبر زندہ ہو۔ کہیں ادھر اُدھر بھٹکتا ہوا اور کبھی نہ کبھی کوئی کشش اسے وطن کھینچ ہی لائے لیکن پھر تاریکیوں کا پردہ چھا جاتا۔ گہرا گہرا عمیق سا پردہ۔

(۴)

شہلا کی اس داستان غم نے مجھے بہت کچھ ان کا ہمدرد بنا دیا۔ بارش والے روز اوروں سے بے اعتنائی کے باوجود انھوں نے نہ صرف مجھے پناہ دی بلکہ قرار واقعی طور پر سردی کا انسداد بھی کیا۔ اس مہربانی نے مجھے اُن کا گرویدہ بنا دیا۔ شہلا

بھی کافی خلوص سے پیش آتیں۔ اس سے لوگوں کو نہ صرف حیرت تھی بلکہ بجا طور پر تعجب بھی۔

میں اکثر ان کی تشفی کرتی رہتی۔ دنیا بہ امید قایم..... کی مصداق یاد دلاتی اور اکبر کے بقید حیات ہونے کا خوش کن یقین دیتی جس پر ان کی آنکھیں دلی جوش سے چمک اٹھتیں۔ زرد زرد رخساروں پر ایک ہلکی سی سرخی کی لہر دوڑ جاتی اور وہ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہتیں " راز! اس تالیف قلب کا اجر تمھیں خداوند کریم دیگا۔ بلند آشیاں معبود تم پر رحم کرے گا"۔

بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ اکبر کا نام آتے ہی گریۂ بے اختیار انھیں بے قابو کر دیتا

میرے واپس لوٹنے کے دن قریب آرہے تھے شہلا کو جس قدر بھی رنج ہوتا کم تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں اس حالت میں چھوڑ کر جانے کو میرا جی کبھی نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے۔ وہ دم بخود تھیں اور میں خاموش۔

وقت کے پر نہیں لیکن پھر بھی اس میں قوت پرواز کیسی تیز ہے۔ دو ماہ پلک جھپکاتے گزر گئے تھے اب میری روانگی میں صرف دس روز باقی رہ گئے تھے

(۵)

پہاڑ کی ٹھنڈی اور شبنم آلود صباح بھی کیسی رومانیت سے لبریز ہوتی ہے۔ میں سورج کی آڑی ترچھی کرنوں سے جگمگاتی ہوئی برف پوش چوٹیوں کو دیکھ رہی تھی۔ سامنے ہی ایک تیز رو نالہ جھاگ بہاتا بہہ رہا تھا۔ شاعر کے خیال کی مانند خوبصورت اور اپنی سعی میں محو۔

میرے تخیلات سرزمین عمر خیام میں چکر کاٹ رہے تھے کہ قریب ہی سے کسی کے آہستہ آہستہ گانے نیز سسک سسک کر رونے کی آواز آئی۔ میں فوراً پہچان گئی کہ یہ شہلا تھیں۔ قدرے آگے بڑھ کر دیکھا واقعی وہی تھیں۔ سامنے والی پگڈنڈی پر نظریں جمائے کچھ تھکے انداز سے کھڑی تھیں۔ شب بیداری کی وجہ سے آنکھوں کے گرد حلقے پڑ رہے تھے۔ وہ کیا گا رہی تھیں میں پوری طرح تو نہ سن سکی تاہم کچھ اس قسم کے الفاظ تھے ؎

سو پلٹے کھائے زمانے نے پر دل کا رخ خوشی نہ بنا
کیا موت کی نیند میں ہے قسمت جو ایک ہی کروٹ سوتی ہے
اس فیصلے پر تیرے ظالم رونے کے ہے قابل حالت دل
ٹوٹا نہ اگر تو پتھر ہے اور چور ہوا تو موتی ہے

وہ نازِ غضب یہ نیازِ ستم ، دم بند ہے اور جینا مشکل
چپ ہیں تو ستائے جاتے ہیں ، بولیں تو شکایت ہوتی ہے
اُلفت میں خموشی پر میری حیرت میں ہیں جو یہ کیا جانیں
پڑتا ہے داغ کلیجے میں اور مہر لبوں پر ہوتی ہے

"شہلا!" میں نے قریب جاکر کہا۔ "آج یہ اضطراب اور بڑھتی ہوئی بے قراری کیسی ؟ کیا تمھیں ذاتِ ایزد پر بھروسا نہیں رہا۔ اس مقدس ذات پر! جو مُردہ صد سالہ میں بھی جان ڈال دیتی ہے پھر اکبر کا تو معاملہ ہی مشکوک ہے"

"یہ بات نہیں راز! وہ اک آہ سرد بھر کر بولیں "لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمھیں خوابوں پر اعتقاد بھی ہے۔ خاص کر صبح صادق کے وقت دیکھے ہوئے خواب پر"

"کچھ کہہ نہیں سکتی" میں نے قدر نے متوحش ہو کر کہا "لیکن کیا تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے جو خزاں دیدہ پتے کی طرح زرد پڑتی جاتی ہو"

"بے شک خواب ہی دیکھ کر میں کچھ سہم گئی ہوں لیکن اسکی صداقت میں مجھے ذرہ بھر بھی شک نہیں۔ تم سنو گی بھی کہ میں نے کیا دیکھا"

"ضرور! اور اب خوفزدہ ہونے کی میری باری تھی

" اسی پگڈنڈی کے راستے سے اکبر آرہے ہیں" شہلا نے خواب شروع کیا "میں ہمہ تن اشتیاق اُن کی راہ تک رہی ہوں - وہ بڑھتے ہیں اور آگے آتے ہیں یہاں تک کہ واضح طور پر اُن کے بھولے ہوئے نقوش نظر آنے لگتے ہیں - اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا - دیوانہ وار آگے بڑھتی ہوں کہ ایک عجیب سی پُراسرار ہستی مجھے مضبوطی سے پکڑ لیتی ہے - میں سیماب وار تڑپتی ہوں - بہتیرا اپنے آپ کو چھڑاتی ہوں لیکن یہ بندش اور بھی سخت تر ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اکبر میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں میں چیخ کر بلانا چاہتی ہوں لیکن منہ سے آواز نہیں نکلتی اور وہ پُراسرار ہستی اسی طرح مجھے تھامے ہوئے نہ معلوم کون سی وادیوں میں پرواز کر جاتی ہے"

" ایسی باتوں پر یقین نہیں کیا کرتے شہلا!" میں نے قدرے آزردگی سے کہا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ خود بھی کانپ رہی تھی

(۶)

اس واقعہ کے چند روز بعد کا ذکر ہے کہ شام کے وقت جب کہ آفتاب بھی غروب ہو چکا تھا شہلا بھاگتی ہوئی آئیں اُنکے

ہاتھوں میں ایک لفافہ تھا جسے حرزِ جان کی طرح مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ مسرت و رنج کے ملے جلے جذبات نے غریب لڑکی کی عجیب حالت بنا رکھی تھی

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اکبر کا خط ہے

"دیا عجب! تو گویا کہ وہ واقعی زندہ تھے لیکن انھوں نے ابتک تمھاری خبر کیوں نہ لی شہلا؟"

جواب میں شہلا خود تحریر پڑھکر سنانے لگیں۔ بہت سی پشیمانی اور اظہارِ افسوس کے بعد لکھا تھا کہ اکبر کا ارادہ کچھ پیسے اکٹھے کر کے شہلا کو حیران کر دینے کا تھا۔ اب وہ اس میں خاطر خواہ کامیاب ہو چکا ہے اس لئے فوری واپسی کا ارادہ ہے۔ اسکے آنے کی تاریخ دیکھی تو وہ تو روزِ فردا ہی تھا

"لو اب خوش ہو جاؤ شہلا!" میں نے سچی مسرت محسوس کرتے ہوئے کہا "رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند"

"لیکن وہ! وہ خواب!!" شہلا دہشت زدہ ہو کر بولیں

"چھوڑو بھی اس قصے کو۔ ایسی باتوں کی بھی کچھ حقیقت ہوا کرتی ہے"

لیکن شہلا تو واقعی آسمانی خلاؤں کی طرف تک رہی تھیں جیسے اس نامعلوم ہستی کو دیکھ رہی ہوں۔ سورج کی رخصتی

شعاعوں میں اُن کا چہرہ ایسا اُداس نظر آتا تھا کہ بے ثباتیٔ دہر کے
احساس نے مجھے ایک حد تک مغموم کر دیا

(۷)

زندگی کی وہ غم آگین صبح میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ سامنے جھیل
کے خاموش نیلے پانی پر آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور سپید سپید پروں والے
جانور ہوجوں کے سینوں پر تیر رہے تھے

آج اکبر کو بذریعہ لاری آنا تھا۔ بقیہ راستہ چڑھائی کا
اور پتھریلا ہونے کی وجہ سے پیدل طے کرنا پڑتا ہے جو کم از کم تین
فرلانگ کے قریب ہوگا

اکبر کے تمام واقفکار شہلا اور میں کافی عرصہ پیشتر وہاں
آ گئے تاکہ وطن کو بھولے ہوئے مسافر کا شایانِ شان استقبال کر سکیں

شہلا کی عجیب کیفیت تھی۔ اُنھیں اس حال میں تو میں نے
کبھی نہیں دیکھا تھا جب وہ مسکراتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوہسار کی
دیوی کوئی المناک گیت گا رہی ہے اور اُن کے آنسوؤں پر مجھے کبھی
گم کردہ راہ جل پری کے قطراتِ اشک کا گمان ہوتا۔ میں وقت کے
جلد جلد گزر جانے کی دُعا دل ہی دل میں مانگ رہی تھی

دور دائرے کی صورت میں چکر کاٹتی ہوئی سڑک پر موٹر

کے ہارن کی آواز آئی۔ میری نظریں فوراً شہلا کی طرف اُٹھ گئیں اور شہلا کی آنکھیں آسمانی خلا کی طرف۔

اللہ کیسا ہوشربا وقت تھا!

میں نے آگے بڑھ کر اُن کی ہمت بندھائی۔ ایسے پُرمسرت لمحات میں غمگین تاثرات کو دل میں جگہ دینے سے روکا لیکن حقیقت پوچھئے تو میرا دل کیلے کے نوخیز پتے کی طرح لرز رہا تھا

(۸)

لاری اب ٹھہر چکی تھی۔ ہم نے بلندی سے جھک جھک کر دیکھنا شروع کیا شاید مسافر بھی اُتر رہے تھے مگر اوپر چڑھنے کے لئے کم از کم نصف گھنٹہ درکار تھا

ہماری طرف آنے والے اشخاص کی تعداد سات یا آٹھ کے قریب تھی اس لیے میں اندازہ نہ لگا سکی کہ ان میں اکبر کون ہوگا لیکن شہلا نے یہ مرحلہ فوراً طے کر دیا سب سے آگے آتے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کر کے انھوں نے شدّتِ جوش سے تھرتھراتی آواز میں کہا کہ "وہی اکبر ہے" میں اپنی ننھی سی دوربین سے دیکھنے لگی۔ اکبر قبیلہ کے لوگوں سے مصافحہ کر رہا تھا لیکن اس کی متلاشی نگاہیں تو شہلا کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ اچانک اُس کی نظر شہلا پر پڑی اور وفورِ اشتیاق سے

ڈگمگاتے قدموں سے بھاگنے لگا

اب شہلا برداشت نہ کر سکیں۔ وہ برق کی سی تیزی سے اٹھیں اور نوکیلی چٹانوں، خاردار جھاڑیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی مخفی قوت سے آگے بڑھنے لگیں

لیکن اللہ! یہ کیا؟ انھوں نے غلط راستہ اختیار کیا تھا جسے پہاڑی لوگ "خونی شاہراہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ راستہ جہاں معمولی سی آہٹ پر بڑے بڑے پتھر انسان کا استقبال کرتے ہیں

شہلا کے پاؤں کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے دفعتاً اُن کا قدم رپٹا اور ایک بڑی سی چٹان کو لئے وہ نیچے ہی نیچے گرتی چلی گئیں

اُف! کچھ نہ پوچھئے کہ جب بیجان نعش ڈیڑھ فرلانگ نیچے سے اٹھائی گئی تو اُس کا کیا حال تھا؟ خاص کر وہ معصوم سا خوبصورت چہرہ تو اس قدر مسخ ہو چکا تھا کہ شاید اکبر بھی ہرگز ہرگز شناخت نہ کر سکتا

بیچاری شہلا! اس کا خواب پورا ہو چکا تھا۔ پر معبود! اس کی تعبیر کیسی اذیت کوش تھی۔

انتقام

آپ نے محبت کی قربانیوں کے بہت سے قصے پڑھے ہونگے۔ اس کی بے چارگی پر ممکن ہے کہ خون کے آنسو بھی بہائے ہوں اور اس کی مجبوریوں پر شاید کف افسوس بھی ملا ہو لیکن "محبت کا انتقام" معاذ اللہ! صحرا کے درندے کی طرح خونخوار ہے اور حرکات مدوجزر کی طرح تیز پا۔۔۔۔ اپنے صید کو بازو شکستہ اور خون غلطیدہ تڑپتے دیکھ کر بھی اسے سیری نہیں ہوتی (م-ر)

(۱)

افسانے کا آخری باب لکھتے لکھتے میں نے دریچے سے باہر نگاہ ڈالی شفق کی چمکیلی روشنی شب کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں گم ہو چکی تھی اور دور لیٹے ہوئے بحیرۂ عرب کی منچلی لہریں اپنے ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر شوریدہ سا شور پیدا کر رہی تھیں۔

افسانے کے غمناک انجام نے میرے احساسات پر کچھ گمشدگی سی طاری کر دی تھی چنانچہ کافی دیر تک اسی طرح رات کے بڑھتے ہوئے

سایوں کا مشاہدہ کرتی رہی اور دریچہ بند کرنے ہی کو تھی کہ اک زور دار آواز سے دروازہ کھول کر رعنا کمرے میں داخل ہوئیں۔ کاہیدہ جسم کی شوخ و طرار لڑکی کچھ عجیب طبیعت کی تھی۔ سنجیدگی تو اُسے کبھی چھو ہی نہ سکی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حافظ شیرازی کے ایک شعر نے رعنا کا روپ لیا ہے

"کیوں صاحب افسانہ ختم ہو چکا یا نہیں؟" وہ حسب معمول بے تکلفی سے بولیں "زیادی کب سے آئے ہوئے ہیں۔ بیچارے بیٹھے بیٹھے اکتا بھی گئے ہوں گے لیکن تمھیں دوسروں کے احساسات سے سروکار ہی کیا؟"

میں اُن کے ساتھ جانے کے لئے اُٹھی "لیکن رعنا" میں نے کہا "اُن سے گفتگو آخر کس موضوع پر ہوگی۔ یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ نہ تو مجھے ایسی باتوں سے دلچسپی ہی ہے اور نہ کبھی مردوں سے بات کرنے کا موقع ملا ہے"

"موقع کی بھی ایک ہی کہی" رعنا تنک کر بولیں "بیچارے مردوں سے تمھیں ازلی تنفر و اجنبیت ٹھیری۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم میں تو کسی بوڑھے مصنف کی روح سما گئی ہے۔ چار روز کے لئے مجھ سے ملنے بھی آئیں تو وہی کتب بینی و افسانہ نگاری۔

(۲)

آج میں نے پہلی بار زیدی کو دیکھا۔ یہ حضرت رعنا کے منگیتر تھے اور بقول اُن کے دنیا بھر کی خوبیوں کا مجموعہ۔ اُنکے اُفق خیالات

کا ستارہ اور نہ معلوم کیا کیا ہونے کا انھیں شرف حاصل تھا سچ تو یہ ہے کہ زیدی کی بڑھتی ہوئی تعریفیں سُن سُن کر میں بھی انھیں اشرف المخلوقات سمجھنے لگی تھی

ہلکا سا بھورے رنگ کا سوٹ اور زرد ہونے ہوئے بھی نسوانی آرائش اگر کسی کو جاذبِ نظر بنا سکتی ہے تو زیدی بھی اس خوبی سے مزین تھے ورنہ انسان کو درجۂ انسانیت سے بھی بڑھا دینے والی تو کوئی خوبی ان میں نظر نہیں آتی تھی۔ تعارف کراتے وقت رعنا فرطِ مسرت سے گلنار ہوئی جاتی تھیں لیکن مجھے نہ معلوم کیوں زیدی پسندیدہ اخلاق کے انسان نظر نہیں آتے تھے۔ اُن کی بیتاب نگاہیں اور انداز گفتگو تو اک معمّا ہو کر رہ گئے۔ بہر حال اگر جذبۂ نفرت کوئی چیز ہے تو زیدی کو دیکھتے ہی میرے دل میں بدرجۂ اتم پیدا ہو چکا تھا

"کیوں راز! یہ سکوت اب ختم بھی ہوگا یا نہیں؟" رعنا کچھ دیر سلسلۂ گفتگو چھیڑنے کی منتظر رہ کر بولیں اور پھر زیدی سے دبنا وٹی خفگی سے "آپ تو ان سے ملنے کے خواہشمند تھے نہ؟ لیکن اب یہ خاموشی کیسی؟" زیدی میری طرف مُڑے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بات چیت کرنے میں ہچکچا رہے ہیں لیکن پیشتر اس کے کہ وہ ایک لفظ بھی کہہ سکتے میں چند الفاظِ معذرت دُہرا تی میز پر رکھا ہوا دیوانِ غالب اُٹھا کر اس

غیر مناسب ماحول سے نکل آئی
کمرے سے رعنا کی آواز آرہی تھی۔ کتابوں سے تو راز کو عشق ہے عشق۔ لیکن مجھے اُنکے آج کے رویہ پر سخت تعجب"
لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے بھی زبیدی کی عجیب سی روش نے سکتہ میں ڈال دیا تھا۔ رعنا جیسی بیدار مغز اور تہذیب یافتہ لڑکی ایسے واہیات انسان کو پسند ہی کیونکر کرسکی اور وہ بھی اس حد تک کہ اس سے وابستہ ہونے کا تہیہ کرلیا۔
اور اس وقت مجھے اُنکے خالہ زاد بھائی فیروزی کا خیال آیا وہ کیسے شریف، اعلیٰ کردار کے نوجوان تھے لیکن ابھی ان دونوں کے منسوب ہونے کی اطلاعات پہنچ رہی تھیں کہ یہ حضرت زبیدی اک مضبوط فصیل کی طرح درمیان میں آکھڑے ہوئے۔ رعنا خودسر تو پہلے ہی سے تھیں نہ معلوم کون سی بات اِن کی پسند آگئی۔
"خودسر لڑکی!" میں سوچنے لگی "بعد میں ضرور پشیمان ہونا پڑیگا"

(۳)

رعنا دو تین روز مجھ سے کھچی کھچی رہیں۔ زبیدی سے بد خُلقی کے ساتھ پیش آنا اک ایسا جرم عظیم تھا جسے وہ شاید کبھی معاف نہ کرتیں لیکن میں نے خوشامد کرکے آخر اُنھیں منا ہی لیا

"خیال تو کرو راز!" آخر وہ غصے سے بھری ہوئی بولیں "کوئی غیر بھی گھر پر آجائے تو اس سے بھی خوش مزاجی اور رواداری سے پیش آنا پڑتا ہے۔ پھر زیدی تو آخر ——"

"تمھارے منسوب ٹھیرے" میں نے جملہ پورا کیا "لیکن رعنا تم خواہ جس قدر بھی ناراض ہو میں اُن کو نیک کردار انسان ماننے سے منکر ہوں"

"کیوں؟ آخر اُن میں بُرائی ہی کیا ہے؟" رعنا کا غصہ بتدریج بڑھ رہا تھا "اگر وہ پاکیزہ اطوار کے اور نیک سیرت نہیں تو دنیا کے کسی انسان کو بھی ان خوبیوں کا حامل نہیں کہا جا سکتا۔ وہ کیا ہیں؟ کم از کم میرے لئے کیا ہیں۔ اس کا اندازہ تم کبھی نہیں لگا سکتیں"

"بے شک نہیں لگا سکتی" میں نے اپنا قصور تسلیم کرتے ہوئے کہا "لیکن عزیز رعنا! تمھیں اس قدر جلد باز نہیں ہونا چاہئے"

"جلد بازی کاہے کی۔ میں گزشتہ چھ ماہ سے زیدی کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں اور اب! اب تو ہم اس درجے پر پہنچ چکے ہیں کہ موت کا زبردست ہاتھ بھی ہم کو جُدا نہیں کر سکتا"

"معبود تمھیں دنیاوی اور جاودانی مسرتوں سے شادماں رکھیں۔ میں خدانخواستہ تمھارے زیاں کی خواہشمند نہیں لیکن پھر بھی"

"اور پھر کیا راز! از راہ کرم اس معاملہ میں دخل اندازی نہ کرو

مجھے روحانی کوفت ہوتی ہے" آگے کچھ کہنا چاہیے کہ جلتی آگ پر تیل چھڑکنا تھا۔ میں خاموش ہو رہی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم دونوں کے مابین ایسی گفتگو ہوئی جو کچھ حد تک درجہ تلخی کو پہنچ گئی تھی

(۳)

اس بات کو کافی عرصہ گزر گیا۔ رعنا آج کل صبح سے شام تک بے حد مصروف رہتیں۔ لوازمات ضروری کی خریداری میں نہ وقت پر کھانا کھانے کا ہوش رہتا نہ سونے کا خیال۔

میں بھی اس وارفتگی کا مطالعہ بہ نظر غائر کر رہی تھی۔ زیدی کا بیشتر وقت بھی آج کل یہاں ہی گزرتا۔ میں اُن سے بے تکلف تو ہو نہ سکی البتہ رعنا کے کہنے سُننے پر پہلی سی جھجک بھی محسوس نہ کرتی تھی۔ تاہم یہ خیال کہ یہ رعنا کے لئے ایک اچھے شوہر بھی ثابت ہونگے یا نہیں، مجھے ہر وقت بیکل سا رکھتا تھا۔ بعض اوقات اپنے شکوک پر خود پشیمان بھی ہوتی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خفیہ طاقت مجھے ہر لمحہ ان کے خلاف ہی کرتی جا رہی ہے۔

رعنا کی مسرتوں کا کیا کہنا۔ انھیں تو عشرت جہاں ویلہ مل چکی تھی۔ اس قدر شگفتہ تو وہ حیات کے کسی شعبہ میں بھی نہ پائی ہونگی۔ آج زیدی فلاں جگہ سیر کے لئے لے گئے۔ فلاں چیز تحفتاً لا کر دی

سفید رنگ کے سوٹ میں تو وہ بیحد اچھے معلوم ہوتے ہیں خاصکر
جب کہ اُس پر ہلکے شوخ رنگ کی ٹائی بھی ہو"

یہ تھے وہ جملے جو ہر وقت اُن کے وردِ زبان رہتے
اور اُن کی خوشنودی کے لئے مجھے طوعاً و کرہاً ہاں میں ہاں ملانی پڑتی۔

وقت یوں ہی اپنی رفتار سے گزر رہا تھا کہ ایک
عجیب واقعہ رونما ہوا جس نے اِس پُر بہجت فضا کا ماحول ہی بدل دیا۔

(۵)

افسانے کے شروع میں جس رات کا ذکر کیا گیا ہے ویسی ہی
پُر سکوت رات تھی لیکن آج آسمانی پہنائیوں میں تارے جگمگا رہے تھے
اور شبِ ماہتاب کی روشنی سے کائنات بقعۂ نور تھی۔ کبھی کبھی کوئی سرد
جھونکا سرو و شمشاد کی شاخوں سے اُلجھ پڑتا تو اِک شور سا پیدا
ہو جاتا۔ سُریلا سا شور۔

میں حسبِ معمول دریچے سے مطالعۂ کائنات کر رہی تھی کہ
اک مدھم آہٹ سُن کر چونک پڑی۔ آنیوالی ہستی رعنا تھیں لیکن کس
حال میں؟ میں تو ششدر رہ گئی۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدم آہستہ آہستہ اُٹھ
رہے تھے۔ چہرہ پژمردہ سا تھا جیسے سورج کی چمکیلی شعاع سے کوئی کلی مرجھا
کر رہ گئی ہو اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے

" ہوا کیا رعنا " میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ تم تو تھیٹر گئی ہوئی تھیں نا؟ کیا زیدی وہاں نہیں ملے یا کسی نے سخت سُست کہا "

" آہ راز ! تم سچی تھیں۔ سو فیصدی سچی " رعنا زار و قطار روتے ہوئے بولیں " پر افسوس کہ میری آنکھوں پر پٹی بندھی رہی "

" لیکن بات کیا ہے آخر " میں اُنھیں چمکارتے ہوئے بولی

" اس بے قراری کی کوئی وجہ بھی تو ہو "

" افسوس ! میری اُمیدوں کا قلعہ مسمار ہو گیا اس دہر میں میں بے یار و مددگار رہ گئی۔ زیدی ظالم زیدی نے مجھے دھوکا دیا مجھ سے فریب " اور اُن کے الفاظ سسکیوں میں تبدیل ہو کر رہ گئے

میں بات کی تہہ کو پہنچ چکی تھی۔ گزشتہ چند روز سے زیدی خلافِ معمول آئے نہیں تھے۔ یہاں تک کہ رعنا نے بُلایا بھی، تو ٹال گئے۔ اِدھر یہ افواہ بھی سُنی گئی کہ اُن کے ساتھ اکثر اوقات ایک اور لڑکی دیکھی جاتی ہے۔ رعنا حقیقتِ حال سے باخبر ہونے پر بحال زار تو پہلے ہی تھیں اس حادثۂ فاجعہ کے ثابت ہونے پر اپنی ہستی سے ہی بیزار ہو گئیں

میں ایک عالمِ تحیّر میں رہ گئی۔ کاش ! رعنا پہلے ہی اس سرشت کے انسان کا اندازہ لگا لیتیں۔

(۶)

اب رعنا وہ رعنا نہیں رہی تھیں۔ حافظ کے شعر نے ایک نالۂ الم کی صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ شوخی اور حاضر جوابی نہ معلوم کہاں رخصت ہو چکی تھی۔ اب وہ تھیں اور یاد ایام۔ میں پورا وقت اُنکی دلدہی میں صرف کرتی۔ ہر ممکن کوشش کرتی کہ وہ زیدی اور اُس کی ناکامیاب و نفرت انگیز محبت کو بھول جائیں صفحۂ دل سے محو کر دیں لیکن بیسود و بے حاصل

میں حکایت غمِ آرزو تو حدیث ماتمِ دلبری

کے مصداق اُن کی بڑھتی ہوئی پریشانی میرے لئے سخت تکلیف دہ تھی لیکن بات ہی کچھ ایسی آپڑی تھی کہ کچھ بنائے نہ بنتا

اب زیدی علانیہ اوّل الذکر لڑکی کے ساتھ پھرتے۔ دو چار بار رعنا سے مڈبھیڑ بھی ہو گئی تو کچھ اس طرح کترا گئے کہ بیچاری لڑکی دل ہی دل میں خاکستر ہو کر رہ گئی وہ اپنی وجہ قصور سمجھنے سے قاصر تھی۔ اور میں اُسکے لئے طریقۂ خوشنودی ڈھونڈنے سے عاجز

زیدی کمبخت پر رہ رہ کر غصّہ آتا۔ رعنا کو ستا کر وہ دہر میں پنپ ہی کیونکر سکیگا۔ اُس کے ننھے سے معصوم دل کو دُکھا کر مٹتا ہلا نہ زندگی خوش و خرم گزارنا ہی ایک ایسا خیال تھا جس پر میں ہرگز بھی یقین

نہ کر سکتی تھی اور رعنا غریب۔ وہ تو

خدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا

کہہ کر گھنٹوں عالمِ سکوت میں کھو جاتیں

(۷)

استدادِ زمانہ سے روز بروز دل روزِ واقعہ بھلا دیتا ہے لیکن فراموش نہ کر سکا تو رعنا کے مجروح دل سے زیدی کی تصویر لیکن اب وہ ہوش میں آ رہی تھیں کسی زخمی شیرنی کی طرح جو چوٹ کھا کر دگنی تیزی سے صیاد پر حملہ آور ہوتی ہے۔ زیدی سے اپنا بدلہ لینے کی کوششوں میں مصروف تھیں

لیکن عورت بیچاری تو ہر شعبہ میں مرد کی زیردست ہے صنفِ نازک کا جنسِ قوی سے مقابلہ ہی کیا پر رعنا چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ اُن کی غضیلی چتونوں سے معلوم ہوتا کہ یا تو زیدی کو صفحۂ دہر سے معدوم کر دینگی یا خود ہمیشہ کیلئے کہیں ناپید ہو جائینگی

"راز" ایک روز وہ صبح ہی صبح کہنے لگیں "آج صیاد خود ہی اپنے پھیلائے ہوئے دام میں آ رہا ہے" کسی مخفی جوش سے اُنکی آواز تھرا رہی تھی اور یاس آلود آنکھوں میں ایک نئی لہر چمک کی پیدا ہو گئی تھی

"لیکن وہ آنے پر راضی کیونکر ہو گئے؟" میں نے کسی ہونیوالے

دہشت ناک منظر کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا

"میرے بلانے پر میں نے لکھ دیا تھا کہ تعلقات ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جانے پر یہی بہتر ہے کہ وہ اپنی پیش کردہ اشیاء بھی واپس لے جائیں۔ اب یہ میرے کس مصرف کی ہیں؟" اس کا جواب جیسی کہ اُمید تھی، اثبات میں آیا ہے

"لیکن رعنا! تم خود ہی یہ چیزیں بھیج دیتیں تو کیا رہتا؟ اُسکے یہاں آنے پر تمھیں روحانی کوفت ہو گی اور بیکار کا رنج اُٹھانا پڑے گا"

"آج ان تمام باتوں کا ہی تو فیصلہ ہو رہا ہے راز! تم کچھ فکر نہ کرو۔ ہاں از راہِ عنایت یہ احسان ضرور کرنا کہ زیدی کی موجودگی میں میرے پاس کوئی بھی نہ آنے پائے"

میں نے وعدہ کر لیا لیکن طبیعت پر کچھ بوجھ سا چھا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رعنا کسی راز کو پوشیدہ رکھنے کیلئے سخت جد و جہد کر رہی ہیں

(۸)

جوں جوں زیدی کے آنے کا وقت ہوتا جاتا تھا۔ رعنا کی حالت متغیر ہو رہی تھی۔ اُن کی وہ اُداس اُداس نگاہیں اور پُر اسرار حرکات و سکنات میں تو کبھی نہیں بھول سکتی۔ بہتیری کوشش کی کہ رعنا کے خیالات کی تہہ تک پہنچ سکوں لیکن بے سود۔

آخرکار ملازم نے اطلاع دی کہ زیدی ملاقات کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ رعنا غش نہ کھا جائیں لیکن وہ اٹھیں اور ایک مردانہ وقار سے اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی کمرۂ ملاقات کی طرف چلیں اور جاتے جاتے مجھے وہیں منتظر رہنے کے لئے کہہ دیا۔ اُس وقت اُن کا چہرہ لاش کی طرح زرد تھا اور ننھے ننھے حسین ہاتھ لرزاں۔

میں عجیب پریشانی میں مبتلا تھی۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والا معاملہ تھا۔ سوچ رہی تھی کہ اگر پانچ منٹ اور رعنا نے نہ بلایا تو تو خود اندر چلی جاؤں گی کہ کمرۂ ملاقات سے ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی اور فضا کی لامتناہیوں میں کھو کر رہ گئی۔ اس کے بعد ایک تلاطم سی کراہٹ اور "ہائے کمبخت مار ڈالا" کے دمِ واپسیں فقرے۔ اس کے بعد ہی ایک زہر خند ہنسی۔ "اور تم جو آج تک مجھے بے موت مارتے رہے" اس سے آگے میں کچھ نہ سن سکی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ افسوس کہ جس بات کا ڈر تھا وہ وقوع پذیر ہو کر رہی۔ شدتِ جذبات اور بڑھتے ہوئے تنفر سے مغلوب رعنا ایک قاتلانہ اقدام کی مرتکب ہو چکی تھیں۔

"رعنا! رعنا!!" میں نے دہشت سے کانپتے ہوئے کہا "یہ تم نے کیا کیا؟"

"ایک ظالم کے وجود سے نجات" رعنا نے ایک ایسے سکون کی

۳۲۹۷۴

حالت میں جواب دیا کہ مجھے کچھ دیر کے لئے اُن کے دیوانہ ہو جانے کا شبہ ہو گیا اور اُسی لمحہ ایک خون آلود خنجر رعنا کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا

(۹)

پاگل خانے کی چہار دیواری سے آج کل ایک حسین لڑکی کی چیخیں گونجا کرتی ہیں۔ وہ رہ رہ کر آہنی سلاخوں سے اپنے آپ کو دے مارتی ہے یہاں تک کہ اُس کے خوشنما جسم سے خون کے فوارے اُچھلنے لگتے ہیں۔

تب وہ چلاتی ہے "قتل! اک بیرحم و ظالم انسان کا خون! محبت کا انتقام!!!" اور اسی طرح کے کئی بے معنی فقرے جن کی تہہ میں حقیقی داستان پوشیدہ ہے۔ یہ رعنا ہیں۔ ان کی حسین آنکھوں میں اب بھی معصومیت جھلک رہی ہے اور فرشتے کی سی لمبی لمبی اُنگلیوں کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کبھی ارادۂ قتل سے بھی اُٹھی ہونگی لیکن پھر بھی وہ مجرم ہیں

بیچاری رعنا! انتقام تو لے ہی لیا لیکن وہ فطری جذبۂ رحم جو ازل سے خواتین کو ودیعت ہوا ہے اُس سے کیونکر چھٹکارا حاصل کرسکتی تھیں۔ اپنے ہی ہاتھوں اپنے محبوب کو بیجان دیکھ کر دماغی توازن کھو بیٹھیں۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے فارغ از ہوش و حواس ہوگئیں۔

(۱)

اک دل ہے اور سیکڑوں صدمے ہزار غم
اک آسمان ٹوٹ پڑا زندگی کے ساتھ

"اُف! اُف!! آج کا دن بھی میری زندگی کا کیسا یادگار دن ثابت ہوا" کہتے ہوئے آصف نے دریچے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ سامنے ہی پگھلی ہوئی چاندی کی ایک بے شکن چادر کی مانند ندی بہہ رہی تھی خوبصورت وسکون کی حد تک سست رفتار۔ لمبے اور گھنے درختوں کی ایک طویل قطار دور تک پھیلتی چلی گئی تھی

وہ بہت دیر تک اس روح افزا منظر کا ماؤف سے دل و دماغ اور متغیر نگاہوں سے مطالعہ کرتا رہا لیکن کائنات کی دلفریبیوں میں اُس کے لئے کوئی جاذبیت باقی نہ رہی تھی وہ تو عالم تصور میں موجوں کے ہلکے ہلکے نغموں میں سیکڑوں پُرالم نالے سُن رہا تھا لرزتے کانپتے چیختے اور چلّاتے ہوئے انسانی ہیولوں کے پارہ ہائے غم۔

درختوں کے پتّے ایک مسرّت بخش احساس سے کپکپا رہے تھے لیکن آصف کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ محروم و سخت جان غربت، سرمایہ داروں کے آہنی شکنجے میں لرز رہی ہے

"تخیّل کا حد سے زیادہ مجبور ہونا بھی تو اُس کے یکسر عاری ہونے سے کم نہیں" اُس نے دل ہی دل میں کہا "لیکن نہیں! دنیا کی کوئی طاقت میرے مستقل ارادے کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ اپنے مفلس و مظلوم بھائیوں کیلئے میں اپنے کو وقف کر چکا ہوں۔ اپنے عہد سے سرتابی کا مجھے خیال بھی ہرگز نہیں آ سکتا"۔ اُس کی قوتِ اعتماد تیز ہونے لگی "مقدس داور! مجھے ہمّت، جوش اور استقلال عطا فرما"۔ کسی غیر اختیاری جذبے سے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے اُس نے کہا "ماں کی الفت، بہن بھائیوں کی محبّت اور اس ناز و نعم کے گہوارے کے ذرّے ذرّے کی شفقت مجھے اپنے مزدور بھائیوں کی بہبودی کیلئے قربان کرنی ہوگی۔ کاش! میں ازمنۂ ماضیہ کو ایک واہمہ سمجھتے ہوئے یکسر فراموش کر سکوں۔ اباجان کہتے ہیں کہ اُن کے کہے سے باہر ہو کر میں اس گھر میں رہ نہیں سکتا۔ شب بھر کی مہلت اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے دی گئی ہے۔ اُن کے ہر حکم کی تعمیل میں مجھے سرِ تسلیم خم کرنے میں کبھی اعتراض نہ ہوا لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ بحیثیت مالک زمیندار کے اُن کو کسانوں کے حقوق اور وہ بھی جائز حقوق میں دست اندازی

کرتے دیکھوں اور دخل انداز ہونے سے باز رہوں۔ وہ کسی مصمم ارادے سے اُٹھا۔ مکان کے مانوس در و دیوار پر ایک نگاہِ یاس ڈالی اور دروازہ کھول کر رات کی پھیلی ہوئی تاریکیوں میں غائب ہو گیا

(۲)

تجھ کو مجھ غربت زدہ کے حق میں کیا منظور ہے
پاؤں اُٹھ سکتے نہیں اے ضعف! منزل دور ہے

شکستہ پا اور شکستہ آصف اندھیرے کا سینہ چیرتا ہوا جا رہا تھا۔ کہاں؟ یہ اُس کی فہم سے بعید تھا اور وسعتِ خیال سے دُور۔ اُس کی روح پُرغم کے کونے کونے لپک رہے تھے اور ہر ذرّہ کائنات اک عالمِ اُداسی میں سر جھکائے معلوم ہوتا تھا۔ ایسے سمے میں جب صبح نالہ ہائے اضطراب سے پاش پاش ہو اور قلب گردشِ افلاک سے چور چور تو عزرائیل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ نغماتِ رباب و چنگ سے بڑھ کر خوشگوار معلوم ہوتی ہے اور زندگی کے گزرے ہوئے دلفریب لمحات کسی دیوانے مصوّر کا تخیّل۔

چنانچہ وہ غیر ارادی طور پر رُکا۔ اپنی ابدیت کا راگ الاپتی ہوئی جبلیں ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے مُسکرا مُسکرا کر خوش آمدید کہہ رہی ہوں اور اُن پر رقصاں ماہتابی کرنیں اسطرح لرز رہی تھیں جیسے فانوس میں آتشیں شعلہ جُنباں ہو۔ آصف اس مبہوت کُن منظر کو چند لمحے عالمِ محویت میں دیکھتا رہا

پھر آگے بڑھا۔ بڑھتا گیا اور اپنے تئیں ایک بقرار موج کے حوالے کرنے ہی کو تھا کہ پیچھے سے دو مضبوط ہاتھوں نے تیزی سے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ اک عالم بیزاری میں مڑ کر دیکھا تو ایک نورانی صورت کے بزرگ کو پاس کھڑا پایا جن کے چہرے سے عرفانیت ہویدا تھی اور سب سے بڑھ کر پاکیزگی نمایاں

"جناب محترم! کاش!! آپ مجھے قید حیات سے نجات پا لینے دیتے" آصف نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "جب کہ

کچھ نہیں غیر از مصائب دامن ایام میں

کی مثال مجھ پر صادق آرہی ہے

"عزیزم! انجام حیات اسے نہیں کہا جاتا کہ دنیا کے ساتھ ہی عاقبت بھی برباد کر لی جائے"

"دنیا! دنیا کیسی!! اسے میں چھوڑنے کا عزم صمیم کر چکا تھا لیکن افسوس کہ آپ نے یہ آرزو بھی پوری نہ ہونے دی"

"لیکن دہر تو تم کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ہر کشاکش کا مردانہ وار مقابلہ کرنا زندگی ہے۔ دوسروں کے لئے کچھ کر جانا زندگی ہے نہ کہ ایک معمولی سے مد و جزر ایام سے گھبرا کر جان، جان آفرین کے حوالے کر دینے کو تیار ہو جانا"

"کاش! آپ میرے نغمۂ حیات کی مضطرب سانسیں سن سکتے" آصف نے لہجۂ احتجاج میں کہا "اس تھرتھراتے ہوئے ساز کا ٹوٹ جانا اسکے بار بار بگڑ جانے سے کہیں بہتر ہے"

"لیکن یہ تو اس سے بھی کہیں بڑھکر ہے کہ اسکی لرزش آفرینی سے فضا میں تہلکہ مچا دیا جائے۔ یہ نیلا آسمان لہلہاتے ہوئے تارے، تیرتا ہوا چاند اور رقصاں سبزہ تو ماضی کے گرد آلود آئینے کو مستقبل کی درخشانی سے جلا دینے کا سبق دے رہا ہے"

"آپ کے بیان میں مجھے حقیقت کی روشنی نظر آرہی ہے"

"یہی حقیقت تمھاری رہنمائی کریگی۔ تمھارے ارادے کو کامیاب کرنے سرمایہ داری کو تباہ کرنے، اس کے ذرّے ذرّے کو نابود کرنے اور فضائے نیستی میں تحلیل کرنے میں مدد دیگی۔ یہی نہیں بلکہ آج جو تمھارے نام سے بیزار ہیں وہ فخریہ تمھیں یاد کیا کرینگے ـــــ جاؤ! میری دعائیں تمھارے شامل حال ہیں"

"مقدس باپ!" کہتے ہوئے آصف نے عالم عقیدت میں سر جھکا دیا جسکے جواب میں شیخ بزرگ دعائیہ جملہ کہتے ہوئے جھاڑیوں کے جھنڈ میں غائب ہوگئے

(۳)

خبر ہو غنچوں کو کاش اس کی ہے سوز پنہاں کلی کلی میں
قرار میں وہ مزہ کہاں ہے جو لطف مضمر ہے بے کلی میں

غربت کے غمکدے کو وطن جانتے ہوئے آصف کہاں کہاں بھٹکتا پھرا اس کا اندازہ تو وہی راہرو لگا سکتا ہے جو منزل تک پہنچتے پہنچتے راہ میں تھک کر بیٹھ جائے تاہم پیر روشن ضمیر کی پُر از بیم باتوں نے اُسے پختہ کر دیا تھا اور فکر فردا سے نابلد

ابلق ایام کو "شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن" کے اسباق دُہراتے دیکھ کر بھی اُس کیلئے صرف ایک وجہ تسلی تھی اور وہ یہ کہ جن مفلس بینوا، غریب اور بے یار و مددگار ہستیوں کیلئے وہ کنارہ کش دہر ہونا چاہتا تھا اُن کی دلی ہمدردی اُس کے ساتھ تھی اور اپنی بہبودی و رفاہ کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ پوری طرح سے اُس کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔

دنیا میں جد و جہد کرنے کیلئے فوری ضرورت اعلیٰ تعلیم کی ہوتی ہے۔ آصف اس سے غافل نہ تھا اور اُس وقت بھی جب اُسکے والدین اُس کا نام تک فراموش کر دینا چاہتے تھے وہ تعلیم کے آخری مدارج پوری کامیابی سے طے کر چکا تھا۔

اس سلسلے میں جو جو مصائب اُسے برداشت کرنے پڑے وہ خارج از بحث ہیں لیکن اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی جب ملازمت کی کوئی سبیل نہ نکلی تو ہجوم یاس اور سرمایہ داروں کی فراموشکاری نے اُسے تنذخو بنا دیا اور وہ ہر اُس رکاوٹ کا جو اُسکی سدِ راہ تھی پوری طرح مقابلہ کرنیکو تیار ہو گیا۔

تحریکِ انقلاب اُن دنوں زوروں پر تھی اور پُرجوش قومی و ملکی خیر خواہ مائل بہ اتحاد۔ آصف کیلئے اس سے بڑھ کر دلخوش کُن امر اور کونسا ہو سکتا تھا۔ اپنے سنہرے خواب اب سے تعبیر کے قُرب میں نظر آتے تھے اور اس پاک مقصد کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کا خیال دل و دماغ پر حاوی۔ وقت کی سوئیاں تیزی سے محوِ گردش تھیں۔ بارہ سال کا طویل عرصہ پلک جھپکانے گزر گیا۔ اس دوران میں انقلابی جماعت پوری طرح اپنی تنظیم کر چکی تھی، اور آصف کی فرض شناسی نے اُسے قبل از وقت درجۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ اُس کی آرزوئیں، حسرت و ارمان محض اپنے غربت زدہ برادران سے وابستہ تھیں اور اُن کی فلاح کا خیال دھیرے دھیرے کشتیِ حیات کو ساحلِ مراد کی طرف کھینچ رہا تھا

(۴)

ناکام تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے
یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

آصف: اب وہ گمنام و گم کردہ راہ و ناتوان آصف نہیں رہا تھا جسے بے سروسامانی کی حالت میں والدین نے مہر و شفقت سے محروم کر کے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے عاق کر دیا تھا۔ اب وہ ایک بھاری جماعت کا سرکردہ تھا جس کے ہزاروں کارکن اُس کے والہ و شیدا تھے اور اُسکے

معمولی سے اشارے پر بڑے سے بڑا کام کرنے کو تیار لیکن کیا آصف اپنی
موجودہ زندگی سے مسرور تھا؟ نہیں! اب بھی اُسکے دل میں خلش موجود
تھی جسے عزت و شہرت بھی نہ مٹا سکی اور وہ تھی اپنے والدین کی محرومی ذہن
تصوّر اب بھی اُس کے سامنے وہی مکان لاکر کھڑا کر دیتا جہاں
بچپن کے شگفتہ دن بسر ہوئے تھے۔ ننھے بہن بھائیوں کی طفلانہ شوخیاں
اور ماں کی محبت بھری نظریں اُسے کچھ اور ہی یاد دلا کر بیقرار کر دیتیں
لیکن یکایک یہ منظر تبدیل ہو جاتا۔ تحریک عدم تعاون میں شرکت کی
بنا پر باپ کا بے پناہ غصہ جسے اُس کی ہر ممکن سعی بھی فرو کرنے سے عاری
تھی اور شفیق ماں کی خاموش خفگی اور سب سے بڑھکر اپنے بے یار و مددگار
گھر سے نکالے جانے کا تخیل۔ آصف اپنی ہستی سے بیزار ہو جاتا اور ایک
بار صرف ایک بار اُسی نکہت بیز و مانوس فضا میں پہنچ جانے کیلئے بیتاب
"کاش"! وہ دل ہی دل میں پہروں سوچا کرتا "کاش! اب
بھی آبا کو میرے مشن سے ہمدردی ہو جائے۔ اے کاش! وہ اب بھی
اصلیت کی تہہ کو پہنچ جائیں" اور اسی لمحہ پیر روشن ضمیر کے الفاظ اُسکے
کانوں میں گونجنے لگتے "آج جو تمہارا نام لینے کے روادار نہیں
وہ تمھیں فخریہ یاد کیا کریں گے"
بوڑھا زمیندار بھی اپنے فرزند کے کارناموں سے غافل نہیں تھا

لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ خاموش تھا اور اپنی سرکار پرستی کے ثبوت میں بیٹے کی ہر باغیانہ حرکت پر الزامِ بغاوت لگاتے ہوئے مشتعل سرمایہ پرست باپ، غربت کے حامی بیٹے کو عاق کر کے بھی مطمئن نہیں تھا لیکن آصف کو خوددار ہوتے ہوئے بھی یہ آرزو بیچین کر دیتی کہ ناراض باپ کی خفگی مٹا کے میں کھوئی ہوئی شفقتِ پدری پھر ماں کی حاصل کر سکتا۔ کاش! یہ ممکن ہوتا کہ میں اسی سایۂ لطف و کرم تک پہنچ سکتا" اور وہ گھنٹوں انھیں خیالات میں غلطاں و پیچاں بیٹھا رہتا تاوقتیکہ آمدِ سحر وقت کا اگلا ورق الٹ دیتی۔

(۵)

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کریں گے عرضِ حال اور آپ فرمائیں گے کیا

غربت اور سرمایہ داری کے درمیان کشمکش جاری تھی فرق صرف اتنا تھا کہ ایک طرف دولت، شدت، ثروت اور حکومت کی مخفی مدد تھی اور دوسری طرف بندشیں صرف بندشیں جنکی گرفت لمحہ بہ لمحہ تیز تر ہوتی جاتی آصف پورے غور سے صورت حال کا مطالعہ کر رہا تھا بغاوت کے شعلے بڑھتے بڑھتے اُس کے والد کے موضع فرخ آباد تک جا پہنچے تھے اور قریب تھا کہ وہاں کی مسموم فضا کو جلا کر خاکستر کر دیں

لیکن آصف اُٹھا۔ برق کی سی رفتار سے بڑھا اور اپنے عزیز گاؤں کو
بچانے کا تہیہ کئے ہوئے ہر ممکن ذریعہ کیلئے کمربستہ ہوگیا۔

کسانوں کا مطالبہ تھا کہ امسال فصل معمول سے بھی کم ہوئی ہے
اسلئے لگان میں تخفیف کی جائے لیکن زمیندار صاحب جو اس قسم کی باتوں
کو سرسری سمجھ کر ٹال جانے کے عادی تھے اس جائز اصرار پر تلملا اُٹھے
پولیس کی فوری امداد طلب کیگئی اور ایک باقاعدہ محاذ جنگ قایم ہوگیا

غریب کسانوں پر دوگنی بپتا پڑ گئی تھی۔ اُن کے دل خون کے
آنسو رو رہے تھے لیکن وہ آج "تخت یا تختہ" کا فیصلہ کرنا چاہتے
تھے۔ جوش دمبدم بڑھتا جا رہا تھا۔ پولیس کی ہر ممکن سعی اس
بڑھتے ہوئے ہجوم کو روکنے سے مجبور تھی اور زمیندار صاحب سرمایہ
داری کے مضبوط ترین محل میں بھی اپنے آپکو بلوائیوں کے محاصرے
میں گھرا ہوا بے بس پاتے تھے

اس وقت انہیں آصف کا خیال آرہا تھا اگر اُسے اس
طرح گھر سے نہ دھتکارا جاتا تو کیا عجب کہ اس مفسدے کا یہیں
فیصلہ ہو جاتا لیکن اب تو انہیں جان تک کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

بلوائیوں نے مکان کا دروازہ توڑ دیا وہ سرمایہ داری
کا چمن کچلنے کے لئے قاتلانہ حملہ تک کیلئے تیار تھے۔ زمیندار صاحب

کی صورت نظر آتے ہی جذبات نفرت از سر نو عود کر آئے

آصف اس مشتعل ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ یکایک کسی خیال نے اُسے بالکل ساکت کر دیا۔ خاندانی محبت اسے اپنے خاندان کے بچانے کے لئے یہاں تک گھسیٹ لائی تھی لیکن مظلوم کسانوں کی تباہ حالی نے اُس کی توجہ کو اپنے انقلابی فرض کی طرف منتقل کر دیا۔ اُس کے سامنے اب صرف دو ہی راستے تھے۔ انقلاب اور انقلاب سے غداری اور اس نازک گھڑی میں بھی جب کہ اُس کی خاندانی ملکیت کا سوال درپیش تھا آصف کسانوں کو دھوکا دینے کو تیار نہ تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے لیکن جادۂ انقلاب سے اُس کے پاؤں نہ ڈگمگائے۔ اُس نے کسانوں کا ساتھ دیا۔ چند ہی لمحات میں فرخ آباد کی جاہ و رعنائیوں کا مرکز بلوائیوں کے تصرف میں تھا۔ اور ..... اور زمیندار کی بے سر نعش ایک کونے میں تڑپ رہی تھی۔

(۶)

آصف اس وقت اندھیر گڑھ جیل میں بحیثیت شاہی قیدی کے نظر بند ہے۔ اُسے فرخ آباد کے کسانوں کو بھڑکانے بہکانے اور حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ لیکن وہ خوش ہے اور اس کا عزم پہلے سے زیادہ مستحکم اور ارادے بلند ہیں

جیل جانے سے پہلے اُسے جیون سہارا یعنی اپنا نصف ثانی مل گیا تھا
دردانہ کی وطن دوستی اور مظلوم پروری پہلے ہی کچھ کم نہ تھی۔ آصف
کے چلے جانے سے اُس کے استقلال میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے
آصف کی خالی جگہ اُس نے پُر کی اور مظلوموں کی تعلیم و تنظیم کا
بیڑا اُٹھا لیا۔

کہتے ہیں کہ سچے واقعات اکثر افسانوں سے بڑھ کر ہوشربا اور دردناک ہوتے ہیں ممکن ہے کہ آپ میں سے بہت کو اس سے اتفاق نہ ہو لیکن یقین جانئے کہ ذیل کا واقعہ بالکل سچا ہے اور من وعن اسی طرح کسی مظلوم پر گزر رہا ہے۔ آپ اسے پڑھ کر عبرت حاصل کریں۔ اپنی بے زبان بہن کی بے بسی پر خون کے آنسو بہائیں یا صرف "اونہہ افسانہ ہی تو ہے" کہہ کر خاموش ہو جائیں۔ یہ آپ کا کام ہے (م۔ ر)

رنگِ خوں اشک میں گہرا نظر آتا ہے مجھے
آج دامن پہ کلیجا نظر آتا ہے مجھے

بیچاری زرینہ! آہ مظلوم لڑکی!! زندگی نے اُس سے کیسا بُرا سلوک کیا فلکِ کج رفتار اتنا بگڑا کہ اُس کے اطمینان و مسرت کی ایک ایک پتی توڑ ڈالی پر بھی اُسے چین نہ آیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ گلشنِ ہستی کے اس سرسبز و شاداب غنچہ پر

ایسا وقت بھی آنے والا تھا جو ابلق ایام کی بے پناہ ٹاپوں سے اسے کچل کر رکھ دیگا اور اُس کی زندگی مایوسی و حرماں نصیبی کے غبار سے آلود مطلع میں پنہاں ہو جائے گی

آپ ہی خیال کیجئے کہ کئی بھائیوں میں اکلوتی اور سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے جو لڑکی اتنی اللہ آمین سے پالی جائے۔ جو ایسی ہمہ صفت موصوف ہو کہ اپنے تو اپنے غیر بھی اُس کی خوبیوں کے قدر داں ہوں۔ جو صورت و سیرت میں فرد یکتا ہو۔ وہ فطرت کی بری محض اک ابرو کی جنبش سے کسطرح حسرت و یاس کے عمیق گڑھے میں جا پڑی اور ان مصائب کا پیش خیمہ کوئی اور بھی نہیں، جان چھڑکنے والی ماں ہی نکلی۔

اس نئی روشنی کے زمانے میں بھی اگر کوئی اپنی اٹھارہ سالہ لخت جگر کو جو دنیا بھر کی پاکیزگیوں کا مجموعہ ہو محض دولت کے لالچ میں ایک ساٹھ سالہ کھوسٹ کے حوالہ کر دے تو آپ اسے کیا کہیں گے۔ نا عاقبت اندیش، بے وقوف!! سوسائٹی کا دشمن!!!

مرزا شفیق زرینہ کے والد سمجھاتے رہے بھائیوں نے بہتیرا سر پٹکا خود زرینہ نے بھی اشارتاً و کنایتاً اپنی ناپسندی کا اظہار کیا لیکن بے سود حمیدہ بیگم کی ہٹ کے آگے کسی کی ایک نہ چلی ؎

نہ سمجھا عمر گزری اس بت خود سر کو سمجھاتے   پگھل کر موم ہو جاتا اگر پتھر کو سمجھاتے

بیچاری لڑکی! آخر اُس شخص سے باندھ ہی دی گئی جو عمر میں اُس کے باپ سے
بھی کچھ بڑا ہی تھا۔ کم فہم ماں! اپنے ہاتھوں سے اپنی قرۃ العین کو دولت کی
قربان گاہ پر چڑھا دیا۔ زرینہ کی بیکسی اور قدرت کی ستم ظریفی کا سب کو دلی تاسف
تھا۔ لیکن آہ! اُس کے تو آنسو بھی آنے والے اندیشے نے خشک کر دئے تھے

اُف! اُف!! آپ ہی غور کیجیے جب خرمنِ دل کو حسرت و یاس
کی بجلی جلا کر اس طرح خاکستر کر دے تو آنسو کہاں سے پیدا ہوں۔ وفورِ غم نے
تو اُس کی زبان پر مُہر لگا دی تھی اور وہ ؎

نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم
حدیثِ دل بہ کہ گویم عجب غمے دارم

آہیں بھرتی ہوئی خاموش تھی۔ اپنی آرزوؤں اور ارمانوں کو ناعاقبت اندیش
ماں کی خواہشوں پر قربان کر کے چپ تھی۔ بہرحال شادی نہیں بلکہ
زرینہ کی زندگی کی بربادی ہو گئی اور وہ ماں باپ کے گھر سے رخصت کیا
ہوئی اپنی مسرت و اطمینان قلبی کو بھی وہیں دفن کرتی گئی

زرینہ اب بھی وہی ہے جو چھ ماہ پیشتر تھی لیکن آہ! اُس وقت
کی زرینہ اور آج کی زرینہ میں کتنا فرق ہے۔ اس بے جوڑ شادی کے غم میں
گھل گھل کر اس میں کتنا افسوسناک تغیر پیدا ہو چکا ہے۔ وہی زرینہ جو
زندہ دلی کی تصویر اور شگفتگی حیات کی تفسیر تھی۔ اب مایوسیوں کا مجسمہ اور افسردگی

کا پیکر ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس میں خون کی بہت کمی ہو گئی ہے۔ بھلا جب خون جگر کو سماج جونک بن کر چوس رہے تو خون کی کمی کیونکر نہ ہو۔

جب مسیحا دشمن جاں ہو تو ہو کیونکر علاج
کون رہبر ہو سکے جب خضر بہکانے لگے

میرے آقا! ہندوستانی لڑکی کو زندہ رہنے کا حق ہی کیا ہے؟ جبکہ اس کے جذبات اس طرح پامال کر کے اُسے زندہ درگور کر دیا جاتا ہے۔ کیا وہ صرف اسی لئے دنیا میں آتی ہے کہ صبح ملال اور شام غم بسر کرتے کرتے ایک دن جان، جان آفریں کے حوالے کر دے؟ ناشاد و نامراد اور یہاں کی کیف آفرینیوں سے لطف اندوز ہوئے بغیر

میرے معبود! کیا اُس کے سینے میں دل نہیں ہوتا یا دل میں حسرتیں نہیں ہوتیں؟ کیا وہ رومان کی دنیا میں نہیں بستی؟ یا دنیا اُس کے لئے ایک دہکتا ہوا انگارہ اور بے معنی چیز ہے؟

یہ ہیں وہ خیالات جو ہر مرتبہ زرینہ سے ملنے کے بعد میرے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور گھنٹوں میرے حساس دل کو بیقرار رکھتے ہیں

آج ہندوستانی گھروں میں ایک نہیں ہزارہا ایسی بیکس بے بس مظلوم و معصوم زرینہ موجود ہیں جن کے ساتھ رات دن یہی ظلم و ستم ہو رہا ہے جن کو نہ قانون کی پناہ ہے نہ سماج کی حمایت۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

قربانگاہِ سرمایہ داری

کون کہہ سکتا ہے کہ جنت کے ٹوٹے ہوئے تارے اور سرزمین کشمیر جنت نظیر کی حسین و جمیل اور سرسبز و شاداب وادی گلمرگ کے رہنے والوں کے لئے یہ دنیا ایک دوزخ سے بھی بدتر ہے۔ خدا نے انھیں وہ دل ہی نہیں دئیے جنھیں ماحول کی کیف آفرینی کبھی مسرور کر سکے۔ زندگی کے افکار اور غم لامتناہی کی بندشوں سے آزاد اس شاعروں کے خوابوں کی بستی کے ساکن مفلسی کی ان سخت زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں جن کی مضبوط گرفت روز بروز پیچیدہ ہوتی جاتی ہے ...... زندہ لاشوں کو اپنے نازک دوش کا بار کرنے کے بعد کشاکش حیات کی بڑھتی ہوئی مصروفیتیں انھیں پنپنے ہی کب دیتی ہیں کہ ان کی تفکرات و آلام سے تھکی ہوئی روحوں کو استبداد زمانہ کے مٹتے ہوئے نقوش اور بھی جھکا دیتے ہیں

عید کی متبرک و بہجت آفریں شام ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ مسکرا رہا ہے اور گلمرگ کی رنگین وادی اپنے نئے روپ میں گلاب کا اک نو شگفتہ غنچہ معلوم ہو رہی ہے۔ جو شمیم عطر بیز کے خرام ناز سے بار بار مچل جاتا ہو ——

فضا میں اک عجیب شگفتگی پھیل رہی ہے جیسے خوابوں کی دنیا میں شادمانی کے بہشتی راگ گائے جاتے ہوں

گلمرگ کی بوسیدہ جھونپڑیوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں اس بات کے شاہد ہیں کہ وہاں کی غریب آبادی میں بھی آج زندگی کا کچھ احساس ہو رہا ہے ننھے ننھے بچوں کے معصوم تخیل کی بے پناہ حالیں نشۂ کیف میں اسطرح جھوم رہی ہیں جیسے دیواروں پر کانپتا ہوا سایہ

عبداللہ کشمیری غربت اور خستگی کی زندہ تصویر اس بہجت آفریں عالم میں بھی اپنی واحد "جائیداد" "ڈانڈی" لیے اب تک ایک چٹان پر اس امید میں کھڑا ہے کہ کوئی دولتمند رئیس اس کے نازک دوش پر اک بارِ عظیم بن کر چھا جائے اور اس کے صلے میں کم از کم اتنا عطا کر دے کہ اس کی مظلوم بیوی نورجہاں اور معصوم بچہ رحمان عید کے متبرک دن تو سیر ہو کر کھا لیں

آج تین روز سے اس کے "کاشانۂ غربت" میں نہ چراغ جلا تھا اور نہ چولھا ہی سلگا تھا۔ تین روز کے مسلسل روزے جنھیں فاقہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ اسے جاں بلب بنا چکے تھے اور مفلسی کا مہیب و خوفناک دیو اب بھی اسے اپنے بے پناہ چنگل میں دبوچے پھر رہا تھا۔

"او ڈانڈی والے! کھلن مرگ پہنچانے کا کیا لیگا؟" ایک قوی الجثہ موٹے تازے دولت کے ذہن نے نشۂ دختر رز سے جسے عبداللہ جیسے غربا کے خون کا

آخری قطرہ تک نچوڑ کر حاصل کیا ہوگا مدہوش و سرشار آگے بڑھکر کہا۔

بیکس عبداللہ! اس کے لئے اس سے بڑھکر تائید غیبی اور کیا ہوسکتی تھی آج ننھا رحمان بھوک سے بلبلاتا ہوا اس کی ٹانگوں سے آکر نہیں لپٹے گا اور نہ فلاکت زدگی کے ہاتھوں قبل از وقت مرجھائی ہوئی نورجہاں انہیں کی نگاہوں میں اک معنی خیز حسرت دیکھ کر خاموش رہ جائے گی۔

"حضور! جو کچھ آپ دے دیں" عبداللہ نے بمشکل تمام اپنے خیالات طوفانی اور بوسیدہ جھونپڑی کے تخیل سے چونکتے ہوئے جواب دیا

معاملہ ڈیڑھ سو روپے پر طے ہوگیا اور دوسرے لمحہ میں ایک بے پایاں تن و توش کا بوجھ اس کے گردشِ آفاق سے خزاں رسیدہ اور بھوک سے نڈھال جسم پر اس طرح رکھا تھا جیسے اک نازک سے گلدان میں بھاری پھولوں کا گلدستہ

یہ سودا اسقدر مہنگا تھا غربت کی خونخوار دنیا کے چابک کھاتے ہوئے عبداللہ میں چند قدم چلنے کی سکت ہی کب تھی چہ جائیکہ ایک زندہ اور لحیم شحیم لاش کو اٹھا کر گلمرگ سے کھلن مرگ کا چار میل کا کٹھن پہاڑی راستہ طے کرنا

"تم تو یہیں رہ گئے نامعقول!" چند فرلانگ کا راستہ بمشکل طے ہونے پر دولت کے انبار نے غصہ سے پھنکارتے ہوئے کہا "ہمارا روپیہ مفت کا نہیں۔ اگر نہیں لے جاسکتے تو پیسے واپس دو اور یہاں سے دور ہو جاؤ"

وہ شاندار قلعہ جو عبداللہ کے تخیل نے ان چند منٹوں کے راستے میں

تعمیر کیا تھا سیٹھ جی کے ان تحکمانہ الفاظ سے مسمار ہونے ہی کو تھا کہ وہ سنبھلا اپنے پھولے ہوئے تنفس، ٹوٹتے ہوئے ہاتھ پاؤں اور دکھتے ہوئے جوڑوں کی تکلیف کو اک پارۂ آہ میں تبدیل کرتے ہوئے اور سیٹھ جی کی تکلیف کے خیال سے کانپتے ہوئے جواب دیا

"حضور اطمینان رہئے۔ اپنی جان وتن کی بازی لگا کر بھی آپ کو جلد از جلد بعافیت تمام کھلن مرگ پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں"

سیٹھ جی خاموش ہو گئے۔ غالبًا یہ اُن کی زندگی کا پہلا موقع تھا۔ کہ انھیں ہڈیوں کے اک پنجر اور نحیف و نزار انسان پر کچھ رحم آیا تھا

عبداللہ کی آنکھوں کے آگے چنگاریاں اُڑ رہی تھیں اُس کا جسم انگاروں سے جلتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اُس کی مظلوم روح کشمکش زیست سے رہائی حاصل کرنے کے لئے اسکے فرسودہ جسم سے بیتابانہ جدوجہد میں مصروف تھی لیکن وہ پھر بھی آگے بڑھا جارہا تھا۔ ایک بیہوشی کے عالم میں قدم اٹھائے جارہا تھا کیونکہ ننھے بچے اور معصوم بیوی کی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے اسے اپنی سب تکالیف ہیچ نظر آرہی تھیں۔ اُن کے افلاس سے پژمردہ چہروں کا تصور اُس کے دھڑکتے ہوئے دل کی دھڑکن کو اور بھی زیر زبر کر رہا تھا۔ کوئی مخفی طاقت کشاں کشاں اُس کے کیلے کے نوخیز پتے کی طرح کانپتے ہوئے جسم کو آگے بڑھا رہی تھی۔

"بدتمیز، کمبخت!" سیٹھ جی سخت ناراضگی کے عالم میں فرما رہے تھے۔ تم لوگ حقیقتاً اسی قابل ہو کہ اس سے بھی بُری حالت میں ایک حیوانانہ زندگی گزار سکو۔ کتے کی موت مرو۔ جب تم میں چلنے کی ہمت نہ تھی تو حامی کیوں بھری۔ اگر غروب آفتاب سے پہلے پہلے کھلن مرگ نہ پہنچا دیا تو یاد رکھو کہ تمھاری خیر نہیں"

زندگی کے دوڑتے ہوئے تازہ خون کی بجائے ہڈیوں سے ٹوٹتے ہوئے جسم کو گھسیٹتے، ماحول و موقع کی نزاکت کے پیش نظر منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے غریب عبداللہ ایک آخری جدوجہد میں مصروف تھا۔ اس کے ساز روح کے ہر تعش تار نالہ ہائے اضطراب الاپ رہے تھے لیکن وہ جان کی بازی لگا کر سیٹھ جی کو کھلن مرگ پہنچانا چاہتا تھا

اب اونچے اونچے برف سے لدے ہوئے حسین پہاڑوں کی چوٹیاں صاف نظر آ رہی تھیں اُن سے شفق کا سُہانا رنگ گزر گزر کر درختوں کے پتوں پر اسطرح پڑ رہا تھا جیسے قلزم حسن کی بے پناہ موجیں دشت و جبل میں بہہ رہی ہوں۔

عبداللہ تخیل کی ان وادیوں کی سیر کر رہا تھا جہاں ننھا رحمان اپنے ابا سے مٹی کا ایک ناچیز کھلونا عید کے تحفے کے طور پر پا کر اسقدر شاد و مسرور ہو جائے گا کہ بیساختہ اُس کے گلے میں اپنی ننھی ننھی باہیں حمائل کر دے گا اور عبداللہ اس کے جواب میں اس کی شفاف پیشانی پر جیسے معصومیت کی

دیوی ہر وقت اپنے دامن کے سائے میں رکھتی ہے ایک مسرّت بھرا بوسہ دیکر کیف و سرور کی دنیا میں کھو جائے گا

نور جہاں صبر و رضا کی پتلی، اپنے لال کو مسرور دیکھ کر خود بھی شاد و نہال ہو جائیگی اور جب عبداللہ اپنے کثیف و بوسیدہ بستر پر تھکن سے بار بار کروٹیں بدل رہا ہوگا وہ اپنی ضیا پاش نظروں سے اس کی خستگی جذب کرتی ہوئی اپنے نازک نازک ہاتھوں سے ٹانگیں دبا کر دوسرے روز کی کشاکش حیات سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کے قابل بنا دیگی۔

" چٹاخ " سیٹھ جی کے کوڑے کی آواز، کائنات کی لا متناہی وسعتوں میں گونجی اور فضا کے لرزاں نغموں میں جا بسی عبداللہ کے دلدوز نالۂ درد انگیز کے ساتھ بکھر بکھر اکر رہ گئی۔

تن و جان کی بازی لگا کر بھی فطرت کی ستم ظریفی کا شکار اور تفکرات حیات میں غلطاں و پیچاں فاقہ کش عبداللہ سیٹھ جی کو غروب آفتاب کے وقت کھلن مرگ نہ پہنچا سکا۔ وہاں پہنچنے کے لئے اسے اب بھی کئی فرلانگ کا راستہ طے کرنا تھا جس کے نتیجے کے طور پر سیٹھ جی نے اپنی ننگ انسانیت اور حیوانی ذہنیت کا مظاہرہ اس طرح کیا تھا

عبداللہ بیچارہ اس اچانک حادثہ سے بے خبر تھا۔ وہ ایک بار جھوما اور پیشتر اس کے کہ سیٹھ جی مغلظات بکتے ہوئے ڈانڈی سے اتر کر اسے

اور مارنے کے ارادے سے آگے بڑھیں وہ ایک سخت پتھریلی چٹان پر گر پڑا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون جاری ہو گیا اور مفلسی سرمایہ داری کے بے پناہ ہاتھوں میں اس طرح لرز کر رہ گئی جیسے بہتے ہوئے چشمے کی شوریدہ لہروں پر لرزتا ہوا سایہ۔

اسی لمحہ! ہاں اسی لمحہ!! جب آفتاب اپنی باگ ڈور پر اسرار ملکوں کی جانب موڑ چکا تھا اور ہلال عید نیشکر کے پودوں کے پیچھے سے جھانک جھانک کر مشتاقانِ دید کو سیراب کر رہا تھا۔ عبداللہ چشمۂ موت سے سیراب ہو کر لرزشِ حیات کی سوزاں تاریکیوں سے نجات پا چکا تھا۔

ستاروں نے اس دردناک منظر کو اپنی نیم وا آنکھوں سے دیکھا اور انسان کے اس ننگِ انسانیت سلوک پر سسکیاں بھرنے لگے۔ ماہِ نو نے بادلوں کے سیاہ پردے میں اپنا حسین چہرہ چھپا لیا اور شفق گوں آنسوؤں کے موتی بکھیر کر عبداللہ کی بے گور و کفن لاش پر بسنتی پھول بکھیرنے لگا۔

نور جہاں غریب تمام واقعات سے بے خبر اپنے بچے کو لیے اس امید میں بیٹھی اب تک راہ دیکھ رہی تھی کہ عبداللہ اب آ کر آتشِ گرسنگی کے بجھانے کا سامان کرے گا اور ننھا سا کھلونا پانے کی امید میں ننھے رحمان سے نیند کوسوں دور تھی۔

غلام آباد ہند کی مظلوم خاتون! تو اپنے خاوند کی واپسی کی منتظر ہے لیکن تیرا بےکس سرتاج تو اپنے گوشت اور خون کو بھی سرمایہ داری کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا کر تیرے لئے ایک وقت کی روٹی کا سامان نہ کر سکا

اور معصوم رحمان! تو کھلونوں سے کھیلنا چاہتا ہے جب کہ تیرا باپ خود ہی سرمایہ داری کے آہنی چنگل میں ایک مٹی کے کھلونے کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔

شامِ عید

گرد چہرے پر، پسینے میں جبیں ڈوبی ہوئی
آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی
ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا
درد میں ڈوبی ہوئی مجروح ٹخنے کی صدا
پانی مٹی کی تہوں میں میل سے چکٹے ہوئے
ایک بدبودار میلا چیتھڑا باندھے ہوئے
آ رہا ہے جانور کی طرح گھبرایا ہوا
ہانپتا، گرتا، لرزتا، ٹھوکریں کھاتا ہوا
مضمحل واماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال
چار پیسے کی توقع، سارے کنبے کا خیال

مزدور اور وہ بھی ہندوستانی مزدور!! کائنات کے وسیع رباب کا ایک ایسا شکستہ نغمہ ہے جو کانپتی ہوئی فضا میں گونج کر اسے

اُداسیوں کا مخزن بنا دے، یا اک ہیولائے انسان ہے۔ دم بخود۔ زرد رُو اور صورت بیمار، جس کا لہو، تلاش خود اک میں سیال آتشیں بنکر بہتا ہے۔ اور اک مجموعہ ہے مایوسیوں، ناکامیوں اور ٹوٹے ہوئے دل کے چند ٹکڑوں کا جو زندگی کی ہی پہلی ہی پگڈنڈی پر اُلجھ کر رہ جائے

وہ شام! وہ یادگار شام!! اب بھی یاد ہے جب دیارِ غیر میں کشش وطن نے تعلیمی مصروفیات میں بھی مجبور کر دیا ——— اور ایک ہفتۂ تعطیلات سیر کرنے کے لئے "ملکہ مشرق" (نازک مزاج شعرا اور لطافت طبع سیاحان کا عطا کردہ خطاب مراد کراچی سے ہے) اپنی جملہ دلچسپیوں حسین ساحل اور پوری آب و تاب سے کشاں کشاں ——— اپنی طرف کھینچ رہی تھی

اپنے وطن کا شاندار اسٹیشن، غروب آفتاب کا پُرشکوہ نظارہ اور پھر وہ دلفریب شام عید........ ان ملی جلی مسرت آگینیوں نے کچھ دیر کے لئے مجھے بیخود کر دیا تھا کہ ایکا ایکی ولدوز چیخ نے وہ رنگین خواب جھنجھوڑ ڈالے۔ آہ! وہ صدائے درد! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عرش و فضا کو پرزے پرزے اور روح کو غاکستر کر کے رکھ دیگی

تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ یہ ایک بدنصیب مزدور کی آواز تھی جسے عفریت سرمایہ داری نے قبل از وقت دبوچ لیا اور ایک سیٹھ

صاحب پوری مزدوری یا بہ الفاظ دیگر اپنا حق الخدمت مانگنے کے جرم میں یہ سزا ملی کہ دولت کی طاقتور ٹھوکر نے مفلسی کی ٹوٹی ہوئی کمر کے پرخچے اڑا دیئے۔ آہ! وہ چیخ نہ معلوم کتنی برباد شدہ آرزوؤں کی تفسیر تھی اور سینکڑوں دم توڑتے ہوئے ارمانوں کی غلط تعبیر

میرے تصوّرات نے ایک جھونپڑی میرے سامنے لا کھڑی کی جس میں ایک نوخیز حسینہ پریشاں حال دونوں ہاتھوں میں سر تھامے سرنگوں بیٹھی تھی۔ غالباً اس فکر میں کہ آنے والی شام عید کا استقبال کس طرح کرے۔ کملائے ہوئے زرد چہرے یا ڈبڈبائی ہوئی پُریاس نگاہوں سے آہ! اسے اس خیال نے اور بھی افسردہ کر دیا تھا کہ اس کے گلشن ہستی کی نونہال ننھی سی معصوم کلی! وہ بھی اس بات کی حقدار ہے کہ ملبوسات زریں نہیں تو پیوند لگے ہوئے کپڑے پہن کر ہی اپنا شوق پورا کر سکے پھر! ہاں پھر! اس کی اداس نظروں نے لوٹے ٹوٹے ہوئے حجرے کا جائزہ لیا جس کی کل کائنات مٹی کے چند ٹوٹے ہوئے برتنوں ایک آدھ بوسیدہ چٹائی اور گرد و غبار کے انبار پر مشتمل تھی

اس کے بعد آفاتِ دہر کا ستایا ہوا ایک نوجوان جبر و تشدد درماندگی، افلاس و ناتوانی کا مارا نوجوان ہاتھوں میں ایک انسانی ڈھانچے کو لئے اندر داخل ہوا۔ عید کے میلے میں پھر کر اس کا دل بہلانے

لیکن اپنے قلب وجگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے۔

اپنی بستر ریگ رنج وراحت کو اس طرح غلطاں وپیچاں دیکھکر اس کا دل اور بھی کٹ گیا۔ اس پر معصوم بچی کا ماں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہنا کہ ہم بھی نئے نئے کپڑے پہنیں گے۔ میلہ میں اچھے اچھے کھلونے اور مٹھائیاں بک رہی ہیں اچھی امّی! آپ ہمیں کیوں نہیں لیکر دیتیں؟"

اب یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ دن بھر جانکاہ بیکاری اور گھڑی کی سوئیوں کی طرح محدود دائرہ میں بنار روزی کو تلاش کرنے کے بعد اگر اک حزن آلود نا امیدی اس پر مسلّط بھی ہو چکی تھی تو اس دل فراموش منظر نے دل کے ساکن تاروں کو جھنجھنا دیا اور وہ ان امتداد دہر سے جھکی ہوئی روح کو آخری بار آزمائش میں ڈالنے کو تیار ہو گیا شامت تقدیر اسٹیشن کی طرف کھینچ لے گئی جہاں قیمتی سوٹوں۔ مٹھائیوں سے لبریز ٹوکریوں میں فارغ البالی مسکرایا کرتی ہے اور بڑے بڑے قفلوں سے مقفل صندوق سیم وزر چھپائے رہتے ہیں۔ وہ سیم وزر جو نہ جانے کتنے دکھی دلوں کے قطرات خون کا نچوڑ ہوگا۔

اک بابو صاحب نے اپنا من بھر سے زائد بوجھ اس کی ٹوٹی ہوئی کمر پر لاد دیا اور وہ کمزور بدن جو پہلے ہی افلاس کے پنجوں میں جکڑا ہوا اس طرح کانپ رہا تھا جیسے کوئی ننھی سی کشتی تیز دھارے پر لرزاں ہو

اس وزنی بوجھ سے الاماں پکار اُٹھا ہر حصہ جسم نے آواز بغاوت بلند کی لیکن بابوجی کی گاڑی کی آواز حیات کی کیفیتوں سے تہی دست ہونے پر بھی اسے چار و ناچار آگے بڑھا کر لے ہی گئی

اور بجائے اس کے کہ وہ اس سلوکِ انسانیت پر سرمایہ داری کا سینہ چیر دے، اس کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دے، محض پروانۂ خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وہ سامان تختوں پر احتیاط سے سجانے لگا - بابوجی نے ایک طائرانہ نگاہ اپنے قیمتی سامان پر ڈالی اور دو آنے اس کے آگے اس طرح پھینک دیے جیسے کوئی کتے کے آگے بچی ہوئی ہڈی ڈال دے

وہ قانع ہوتے ہوئے بھی اس معاوضہ پر خاموش نہ رہ سکا صبح سے اب تک کی کلفتوں کی یہ قیمت! اپنے ضمیر کا خون کر کے اس نے دستِ سوال دراز کیا اور آدھ گھنٹہ کی پوری مزدوری جو انصافاً تین آنے ہوتی تھی گڑگڑاتے ہوئے طلب کی ۔ بابوجی جھلا اٹھے۔ ایک ذلیل مزدور کی یہ ہمت کہ امر فیصل شدہ میں دخل دے۔

انھوں نے فوراً اسے گاڑی سے اترنے کا اشارہ کیا اور پس و پیش کرتے دیکھ کر خود یہ کام انجام دینے کو کھڑے ہو گئے۔ اب ریل کچھ کچھ متحرک ہو چکی تھی۔ اس کے کانپتے ہوئے پاؤں باوجود سعیٔ کوشش کے بھی اپنا بوجھ برداشت کرنے سے منکر تھے کہ بابوجی نے غصہ سے آگ بگولا ہوتے ہوئے

باہر کی جانب دھکیلا۔ اُسکے قدم رپٹ گئے اور سرمایہ دار کو فتح عظیم دیتے ہوئے "غربت" اُس کے قدموں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی

مادرِ وطن! یہ بھی "شامِ عید" تیری آغوش میں پروان چڑھے ہوئے نادار کی آہ! تیرے فرزند کا خون کس قدر ارزاں ہے اس کی زندگی کی کچھ قیمت بھی ہے تو صرف "ایک آنہ"

"اے کاش"! ان تاثرات سے چونکتے ہوئے بے اختیار میری زبان سے نکلا "کاش! کوئی اس سرمایہ داری کو بھی اسی طرح پیس دے جلا دے، برباد کر دے اور خاکستر کر دے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ اور آنسوؤں کے اک سیلاب نے یہ مصرعے زبانِ حال سے ادا کر دئے ؎

دیکھ اے قارونِ اعظم دیکھ اے سرمایہ دار
نامرادی کا مرقع، بے کسی کا شاہکار
گو کہ ہے تیری طرح انساں مگر مقہور ہے
دیکھ لے دولت کے اندھے سانپ یہ مزدور ہے

خوبی کا تیری بسکہ اک عالم گواہ ہے   اپنی بغیر دیکھے ہی حالت تباہ ہے

خزاں کی اس اُداس شام میں بے حد مسرور تھی اسقدر زیادہ
کہ ارد گرد کے افسردہ مناظر بھی اس مسرت کو کم کرنے سے معذور تھے
دن کی روشنی آہستہ آہستہ دھندلکے میں تبدیل ہو رہی تھی اور اُفق
مغرب پر جھکا ہوا آفتاب رخصتی تیاریوں میں مصروف تھا
اک اُچٹتی ہوئی نگاہ میں نے فطرت کی بدلتی ہوئی تصویر پر ڈالی
اور بلا مبالغہ بیسویں بار وہ معطر ننھا سا لفافہ دراز سے نکال کر پڑھنے لگی
جس نے میری دنیائے تخیل میں اک خوشگوار تہلکہ مچا دیا تھا۔
آپ ہی خیال کیجیے کہ اگر ملک کا ایک مشہور و مایہ ناز انشا پرداز
جو شہرت جاوداں کا مالک ہو جسے ہر علمی و ادبی محفل میں مدعو کرنا فرض
اولین سمجھا جائے اور جسکی تصانیف کا سینکڑوں نگاہیں بیتابی سے طواف
کریں ایسی شخصیت نہ صرف اپنے گرامی ناموں سے ممنون کرم کرے بلکہ شرف
ملاقات کی بھی اطلاع دے تو کیا آپ فرط مسرت سے بیخود نہ ہو جائیں گے؟

سالِ گزشتہ سے جب میرے مضامین چند ادبی رسائل شائع کرنے لگے تھے۔ یہ خیال بھی کیسے آسکتا تھا کہ تفریحاً اختیار کیا ہوا یہ شوق "ریحان سُہیلی" کی توجہ کا باعث ہوگا اور اُن کی سی سراپا شعریت اور موجدِ ادب ہستی کو خط و کتابت پر مجبور کر دیگا لیکن اب اس کا ذکر ہی کیا ؟

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

ہاں ! تو اس شام میں ریحان سہیلی کا خط ہی پڑھ پڑھ کر آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ "اللہ ہمارا معمولی سلسلۂ خط و کتابت اب اس درجہ تک پہنچ گیا ہے کہ صاحب موصوف مشرف بہ ملاقات فرمانا چاہتے ہیں" اس غیر متوقع ملاقات کے تصور نے مجھے نہ صرف متعجب ہی کر دیا تھا بلکہ فرطِ اشتیاق سے گلابی بھی۔

نیرہ میری بچپن کی دوست تھیں۔ زمانۂ طالبعلمی میں بھی ہر وقت کی رفاقت نے اس دوستی کو خواہرانہ محبت میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زمانۂ تعطیلات اپنے والدین کے ہمراہ کوہ مری پر گزارنے کی بجائے انھوں نے میری قربت کو ترجیح دی اور گزشتہ ماہ سے ہمارے ہاں ہی مقیم تھیں ریحان سہیلی کے ہر وقت کے ذکرِ خیر نے انھیں کچھ چڑچڑا سا کر دیا تھا۔ بلکہ بقول اُن کے وہ انھیں اپنا رقیب سمجھنے لگی تھیں اور اُس پر مستزاد سہیلی کی آمد کی خبر ...... سمندِ ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوئی

چنانچہ مجھے اس طرح بیقرار دیکھ کر وہ ایک کونے میں کتاب لے کر بیٹھ گئیں اور کوئی موقع ہوتا تو انھیں خاموش دیکھ کر میں سو بار مناتی لیکن اب۔ اب جو منصوبے میں نے گانٹھ رکھے تھے ان سے مقابلہ کر کے نیرّہ کی ہٹ دھرمی پر سخت غصہ آرہا تھا "ضدی لڑکی" میں نے دل ہی دل میں کہا "شاید میری خوش نصیبی پر رشک کر رہی ہے"

بےچینی سے کمرے کا طواف کرتے ہوئے ایکبار میں نے نیرّہ کی پہنتی بلّی کا پاؤں کچل دیا بھری تو بیٹھی ہی تھیں۔ آپے سے باہر ہوگئیں۔

"آخر یہ ہو کیا رہا ہے راز!" وہ لہجۂ ناراضگی میں بولیں "سُہیلی صاحب آرہے ہیں تھیں مبارک! لیکن خدارا ہمیں تو پریشان نہ کرو۔ آخر تھیں قرار کیوں نہیں"

"نیرّہ پیاری! میں تو اس خیال ہی سے چونک رہی ہوں کہ سُہیلی صاحب کا سامنا کیونکر کرسکوں گی، ایسے نادر الوجود اور باکمال ادیب ہونے کے ساتھ اگر وہ اتنے ہی بارعب بھی ہوئے تو مجھے تو ڈر ہے کہ شاید شایانِ شان الفاظ میں خوش آمدید بھی نہ کہہ سکوں"

"فرض کرو! فرض کرو!" نیرّہ صلح کُل انداز میں کہنے لگیں "وہ تمھارے سوچے ہوئے ریحان سُہیلی سے بالکل متضاد ہوں یعنی ایک پیکرِ الوہیت کے بجائے مجسمۂ کراہیت تو پھر؟"

"او تم بیوقوف لڑکی" میں نے بُرا مان کر کہا "تم ایسے

پیارے نام اور اس کی جنبش قلم سے نکلے ہوئے دلفریب الفاظ دیکھکر بھی یہ اندازہ لگانے سے قاصر ہو کہ وہ خود کیا چیز ہوں گے"

لیکن نیرہ یہ دلیل ماننے سے منکر تھیں۔ ان کے خیالات اس بارے میں کچھ اور ہی تھے چنانچہ اتنا اصرار دیکھ کر میں بھی خاموش ہو رہی

شب کے کھانے پر پھر ایکبار سہیلی کا ذکر چھیڑا تو نیرہ کھانے سے ہاتھ کھینچکر اٹھنے ہی کو تھیں لیکن میں نے خوشامد کر کے (اپنے اوپر جبر کرتے ہوئے) پھر سے بٹھا لیا لیکن اس میں میرا کیا قصور کہ ان کا حسین ہیولی دل و دماغ میں چکر کاٹ رہا تھا

سوتے وقت میں نیرہ سے یہ کہے بغیر نہ رہ سکی کہ جن جادو نگار انگلیوں سے سہیلی الفاظ کے موتی پروتے ہیں وہ کیسی خوشنما اور نازک ہونگی اور انکے پراسرار بال! نہ معلوم کتنے خوشرنگ اور گھونگریالے ہوں"

جس پر نیرہ نے یہ کہکر ان کی توہین کی تھی کہ شاید ان کے بال کرخت، شرمندۂ شانہ اور افریقہ کے حبشی کی طرح بے اندازہ کنڈلیوں والے ہوں اور انگلیوں کی بابت تو ان کی قطعی رائے تھی کہ پھولی پھولی سخت ہونگی

لیکن مجھے ایسی باتوں کی پروا کب تھی ان ننھی ننھی انگلیوں اور بھینی بھینی خوشبو والے بالوں کی قدر وہ جانتیں بھی کیونکر"

خواب میں بھی سہیلی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میرے تصور سے کہیں زیادہ حسین تھے

آج کی صبح میرے لئے سخت تکلیف دہ اور انتظار کُن تھی کیونکہ حسب وعدہ سہیلی صاحب بذریعہ تار اطلاع دے رہے تھے کہ وہ کونسی گاڑی سے پہنچ رہے ہیں۔ ہر ہر راہگیر پر مجھے ہرکارہ کا دھوکا ہوتا اور بار بار گھڑی میں وقت دیکھ کر جھنجھلا اُٹھتی

نیرہ یہ حالت دیکھکر اپنے کمرے کا دروازہ بند کرکے اندر جا بیٹھیں اس بیچینی سے میں نے کسی ضروری سے ضروری خط کا بھی کبھی انتظار نہیں کیا تھا پیمانۂ صبر لبریز ہونے ہی کو تھا کہ خدا خدا کرکے پوسٹمین شعاعِ اُمید بن کر آ گیا "سہیلی صاحب کل صبح کی گاڑی سے پہنچ رہے تھے ورنہ شام کو تو ضرور حاضر ہوں گے"

کچھ نہ پوچھئے کہ بقیہ وقت کیونکر گزرا۔ ایک ایک چیز کتنی بار رکھی اور اُٹھائی گئی اور ایک ایک گوشے کو کس کس انداز سے سجایا گیا۔ اس سلسلے میں نیرہ کی مدد نہ لینے پر فیصل ہو چکی تھی اس لئے وہ یہ بوکھلاہٹ دیکھ کر دور دور ہی سے ہنستی رہیں

سہیلی صاحب کے خطوط عموماً سبز رنگ کے لفافوں میں آیا کرتے تھے اس لئے یہ خیال شدت سے میرے دل میں جاگزیں ہو چکا تھا کہ انہیں

اس رنگ سے اُنسیت ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ اسی مناسبت سے ہر ایک پردہ
کُشن اور میز پوش سبز ہی رکھا گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس رنگ کے گلدستوں
میں بھی ان پھولوں کی اکثریت تھی جو پتوں کے عنصر سے سبزی مائل معلوم ہوں
اور دن بھر کی تگ و دو کے بعد جب اک طائرانہ نظر میں نے
ان تیاریوں پر ڈالی تو یہ دیکھ کر کلفت آدھی بھی نہ رہی کہ سُہیلی صاحب کا
اک نگاہِ غلط انداز سے دیکھ لینا ہی میری محنت کی وصولی کا باعث ہوگا

وہی مجھ کو عیشِ دوام ہے جو کرے تو ایک نظر سے خوش

صباح دوشنبہ۔ ریحان سُہیلی کی آمد کی حامل بن کر آئی۔ آج کائنات
مجھے بے طرح مُسکراتی نظر آتی تھی۔ اُفقِ مشرق پر ہلکا ہلکا سپیدۂ سحر
نمودار تھا اور سورج کی آڑی ترچھی کرنیں دور کی پہاڑیوں سے جھانک رہی تھیں

"اُٹھو! اُٹھو!" میں نے تبدیلیٔ لباس کے بعد نیّرہ کا شانہ ہلاتے
ہوئے کہا۔ "اتنا دن چڑھ آیا ہے لیکن تمھاری نیند ختم ہونے میں نہیں
آتی۔ گاڑی کے آنے کا وقت قریب ہے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ"

"از برائے خدا! صبح ہی صبح تنگ نہ کرو" نیّرہ جو اب تک سونے
کا بہانہ کئے لیٹی ہوئی تھیں۔ بیزارگی سے آنکھیں ملتے ہوئے بولیں "سُہیلی
صاحب نہ ہوئے اک بیٹھے بٹھائے کی مصیبت ہو گئی۔ تم خود ہی جا کر کیوں
نہ لے آؤ۔ جب اُن کے لئے ہوش و حواس بھی کھو دئے۔ اللہ کی بندی!

ابھی تو سات نہیں بجے اور اُن کی ایکسپریس نو بجے پہنچے گی "

" لیکن تمھیں تیار بھی تو ہونا ہے۔ اس کے علاوہ میرے لباس کی بابت بھی تو رائے دو کہ کچھ کمی تو نہیں رہ گئی اور سب سے بڑھ کر سُہیلی صاحب کی پسند کا ناشتہ ہونا چاہیئے۔ باورچی آرڈر کا منتظر ہے کہو! کیا کیا چیز تیار کی جائے "

" ایک کپ چائے کا اور ڈبل روٹی کے کچھ قتلے۔ آخر وہ بھی تو انسان ہی ہیں نا۔ کیا شاعروں کیلئے ناشتہ بھی خوانِ یغما میں لگ کر اُترتا ہے بھئی! تمھاری اِن باتوں نے تو مجھے ستا مارا۔ میں آج شام کی گاڑی سے واپس جا رہی ہوں "

" یہ باتیں تو پھر بھی ہوتی رہیں گی۔ نیرّہ بہن! میرا انھیں چمکارتے ہوئے بولی " لو اب جلدی سے اُٹھ کھڑی ہو۔ کار باہر تیار کھڑی ہے تب تک تم تبدیلِ لباس سے فارغ ہو جاؤ۔ ہاں ناشتہ تو سُہیلی صاحب کے ساتھ ہی ہوگا نا؟ "

" ضرور بشرطیکہ تمھیں بھوک نہیں لگ رہی ہو لیکن میں کسی کے لئے اتنی دیر کیوں صبر کروں "؟

" خفت مٹانے کے لئے میں تنقیدی نگاہوں سے اپنے لباس کا جائزہ لینے لگی۔ گہری گہری سبز ساری تھی اور اسی سے ملتا جلتا بلاؤز۔ پیچ پورا

پورا کرنے کے لئے آویزوں اور سنٹوں میں بھی میں نے یہی یکسانیت رکھی تھی
نیرّہ نے اس کے برعکس میرے انتخاب کی داد دینا
بھی گناہِ عظیم سمجھا لیکن میں نے تو سُہیلی کے پسندیدہ رنگ کو
منتخب کیا تھا کسی کی ناپسندی کا سوال ہی کیا؟
عین وقت پر ہم اسٹیشن پہنچ گئے۔ میرا دل بُری طرح دھڑک
رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں! شاید سُہیلی صاحب کا سامنا کرنے سے یہ ہچکچاہٹ
سی ہو رہی تھی۔ اُف! اُن کی محیر العقول شخصیت کا رُعب"
پندرہ منٹ میں ایک ایک ڈبے کی تلاشی لے لی لیکن
جس صورت کا مجھے انتظار تھا وہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔ اُترتے ہوئے
مسافروں کو خوب غور سے دیکھا۔ لیکن بےسود!۔
سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبہ میں، میں غائر نظروں سے دیکھتے
ہوئے بولی "شاید کسی مشاعرہ میں شرکت کی وجہ سے سُہیلی صاحب اس
گاڑی میں نہ آسکے جبھی تو انھوں نے واضح الفاظ میں لکھ دیا تھا" یہ کہتے ہوئے
نیرّہ سے آنکھیں چار کرنے سے کترا رہی تھی اور دل بھی ڈوبا ڈوبا ہو رہا تھا
"جی ہاں! یہی بات ہوگی" نیرّہ نقل اُتار کر بولیں "تم سی سرکش
لڑکی کے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہیئے۔ کیوں صاحب، فرطِ شوق میں
تم اُن کی روانگی کی تاریخ تو غلط نہیں سمجھ بیٹھیں"

"نہیں! میں نے لہجہ وثوق میں جواب دیا۔ وہ آج ہی آئیں گے ممکن ہے کہ کسی انجمن نے سپاسنامہ دینے کیلئے ٹھیرا لیا ہو"

"بد اخلاق اتنے کہ پابندیٔ وقت اور تمھارے انتظار کا بھی خیال نہ ہوا۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں"

"نیرہ" میں نے گفتگو ختم کرنے کی غرض سے کہا اور تھکے تھکے قدموں سے ایک مرتبہ پھر تلاش جاری رکھنے کے ارادے سے آگے بڑھنے ہی کو تھی کہ اک عجیب الہیئت آدمی جو بار بار مجھے متجسس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا شاید ہماری گفتگو بھی سن رہا تھا تیز تیز قدم اٹھاتا میری طرف آنے لگا.... اس کے ایک ہاتھ میں کتابوں کا بنڈل تھا اور دوسرے میں شاید کپڑوں کا بکس

اس کی طرف دیکھنے سے نہ معلوم مجھے الجھن سی کیوں ہونے لگی

زرد زرد ملا توتوں کا سا چہرہ، مونچھیں لمبی لمبی خم دی ہوئی۔ اور شانوں تک لمبے بال عجیب طرح لہراتے ہوئے۔ آنکھیں تو خاصکر ایسی وحشت زدہ تھیں کہ مجھے دہشت محسوس ہونے لگی۔

"خدانخواستہ"! میں نے دل ہی دل میں کہا "خدانخواستہ ریحان سہیلی اگر اس شخص سے عشر عشیر بھی ملتے ہوئے"... ——— اور اس تصور سے مجھے پھریری سی آگئی۔

"خاتون!" وہ مجھے مخاطب کرکے کہنے لگا "اگر کوئی ہرج نہ ہو تو یہ بتائیے کہ آپ ہی وہ صاحب ہیں جو "الشہ راز" کے نام سے مضامین لکھا کرتی ہیں نیز..... کے سالنامہ میں بھی شاید آپ ہی کی تصویر شایع ہوئی ہے"

"پھر" میں کچھ چڑ کر بولی۔ (کتابوں کے بنڈل کی طرف دیکھتے ہوئے) شاید آپ کسی مکتبہ کے ایجنٹ ہیں۔ لیکن بھلے آدمی! یہ بھی کوئی موقع کتابوں کی خریداری کا ہے (اور پھر نیرّہ سے) آؤ آخری مرتبہ قسمت آزمائی کر کے دیکھ لیں"

"جی نہیں"! وہ صاحب سلسلۂ گفتگو جاری رکھنے کی غرض سے بولے "آپکو غلط فہمی ہوئی۔ میں کتابوں کا ایجنٹ نہیں بلکہ خود کتابیں".....

"جی میں سمجھ گئی کہ آپ خود کتابیں شائع کرتے ہیں" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "اس سلسلہ میں میرے ناچیز مضامین کو بھی جامہ پہنانے کا خیال ہو تو اس کے لئے شکر گزار ہوں لیکن میں نے عرض کیا نہ کہ فرصت کے وقت اس بارے میں پوری طرح گفتگو ہو سکے گی۔ اپنا ایڈریس دئے دیتی ہوں۔ کبھی مکان پر آئیے گا"

یہ کہہ کر نیرّہ کا ہاتھ کھینچتے ہوئے میں آگے بڑھ گئی لیکن افسوس کہ یہ سعیٔ تلاش، تلاش ناکام سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی

آہ! میری بے پناہ صبر آزمائیوں کا یہ انجام۔ میں بری طرح

ڈھال سی ہوگئی۔ جی چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں لیکن
نیرّہ کے سامنے اور بھی مخجل ہونے کے خوف سے زبردستی ضبط کرتی رہی

واپسی میں بھی تمام راستے کھوئی کھوئی سی رہی۔ نیرّہ کو شاید
یہ حالت دیکھ کر ترس آگیا کیونکہ وہ بھی یہ کہہ کر تسلّی دینے لگیں "کہ اس قدر
افسردگی کی بات ہی کیا ہے۔ شام کی گاڑی سے تو سہیل ویسے بھی آرہے ہیں"

دو دن کی پیہم مصروفیت اور اس کے بعد آج کی کوفت نے
مجھے خستہ کردیا تھا۔ سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا جو بڑھتے بڑھتے شدّت
اختیار کرگیا۔ مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں اسٹیشن پر جانے سے نہ رہ جاؤں لیکن
جب کچھ کچھ حرارت بھی محسوس ہونے لگی تو نیرّہ نے یہ کہہ کر خوفزدہ کردیا کہ اگر باہر
نکلو گی تو ہوا لگ کر اور بھی طبیعت خراب ہوجائے گی۔ بہتر ہے کہ کوئین
کا مکسچر پی کر مکان پر ہی ٹھیرو۔ تمھاری بجائے میں ریحان سہیل کو لے آؤں گی"

"لیکن نیرّہ مجھے اس بات کا دھڑکا لگا رہے گا کہ تم نامعلوم
اُن کا شایانِ شان خیر مقدم بھی کرسکو یا نہیں"

"جہنّم میں جائے تمھارا خیر مقدم! اتنی دردسری کا نتیجہ دیکھ
تو لیا۔ اس پر بھی اُس کمبخت کا اتنا خیال"

"میں خاموش ہو رہی کہ کہیں جانے سے ہی انکار نہ کردیں
اور بیچارے سہیل کو پریشان ہونا پڑے"

نیّرہ کے جانے کے بعد میں برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹ رہی تاکہ جیسے ہی کار آئے فوراً دور سے نظر آسکے جوں جوں اُنکی آمد کا وقت آتا جاتا میرا دل بلّیوں اُچھل رہا تھا اور روح پر اک عجیب کیفیت طاری تھی

خدا خدا کرکے ہارن کی جانی پہچانی آواز آئی میں جلدی سے آئینے کے پاس گئی۔ چہرہ گوناگوں تصورات سے تمتما رہا تھا۔ پف کی ہلکی سی تہہ سے اُسے درست کیا اور ساری سنبھالتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ سامنے سے نیّرہ آرہی تھیں۔ وفورِ جوش سے مرتعش آواز میں جبکہ الفاظ بھی منہ سے پھسل پھسل پڑتے تھے بمشکل اتنا کہہ سکی "ابا بتاؤ نیّرہ! آگئے یا نہیں سہیلی صاحب! کہو تمھارے اندازے سے کچھ بڑھکر بھی ہیں یا؟"

"بلکہ اس سے کہیں زیادہ خوشرو"۔ نیّرہ اک عجیب انداز سے بولیں "بہرحال جلد جاؤ وہ تمھارے منتظر ہیں"

الفاظ معذرت دُہراتی اور اس بیوقت کی ناسازیٔ طبع پر ملامت کرتی میں جلد جلد آگے بڑھی لیکن یہ کیا؟ سُہیلی صاحب تو کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ ہاں سامنے ہی وہی صبح والا واہیات ایجنٹ، کتابیں ہاتھوں میں پکڑے باغیچہ کی زیبائش دیکھنے میں مصروف تھا

"ایں یہ کیا! سہیلی صاحب آخر گئے کہاں"؟ میں دل ہی دل میں سوچنے لگی "اور یہ کمبخت آدمی باوجود مناسب سرزنش کے ابھی سے آموجود ہوا

"اس قدر بے توقف نہ بنو نیرّہ!"

لیکن نیرّہ اب ان کا تعارفی کارڈ دکھا رہی تھیں جس پر بڑے بڑے الفاظ میں مرقوم تھا "ریحان سہیلی سرتاج شعراء فخر ادبا وغیرہ وغیرہ"

قریب ہی ان کی تصانیف "دامن باغباں" "تخیل جمیل" اور "نغمات نیم شب" بکھری پڑی تھیں جو مجھے تحفتاً پیش کرنے کو لائی گئی تھیں

مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ ہوش و حواس معطل ہوئے جا رہے ہیں۔ اگر دیوار کا سہارا نہ لے لیتی تو یقیناً گر پڑتی لیکن بجائے بیہوش ہو کر گرنے کے میرے منہ سے صرف یہی نکل سکا "ارے"

اور میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے ریحان سہیلی کو دیکھ رہی تھی جو ایک خطاوار ملزم کی طرح شرمندگی سے سر جھکائے کھڑے تھے اور نیرّہ بید مجنوں کے درختوں کے شمار میں مصروف تھی

ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ فضا کا پردۂ سیمیں اتار کر کسی نے ردائے عنبری اڑھا دی ہو اور مسرت کی شعاعوں کو تاریکی نے جذب کر لیا ہے

"اف! میری تقدیر" میں نے اپنے کو زیر لب کہتے سنا

ہم تو کیا سمجھے تھے کیا نکلے - بڑا دھوکا ہوا

سرابِ زندگی

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نا و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب
اہلِ صورت کا ہے دریا اہلِ معنی کا سراب

کسی مفلس، غریب، مفلوک الحال تنگدست کو دولت کا اچانک خلاف توقع مل جانا اگر دیوانہ نہیں بناتا تو کچھ عرصے کیلئے مدہوش تو ضرور کر دیتا ہے بعینہ یہی کیفیت راشد کی ہوئی اُس کو ڈربی لاٹری میں دو لاکھ روپے کیا ملے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا

جس پر راشد پروانہ وار فدا تھا اور تقریباً بیس ہزار روپیہ نقد اور تحائف
کی صورت میں اس پر نچھاور کر چکا تھا اُسے تہی دست دیکھ کر ٹکا سا جواب
دے دیا۔ ستم پر ستم بڑھتے ہوئے مصارف نے راشد کو تین ہزار کا قرض
دار بھی کر دیا تھا اور اسکے جگری دوست قاسم میاں نے یہ دیکھ کر کہ جس
اُمید پر راشد کو قرض دیا تھا وہ اب بر آنی مشکل ہے مقدمہ دائر کر دیا

مقدمہ کی پیشی کی رات راشد بیحد افسردہ تھا دوستوں کی بیوفائی
اور آخری بائی کی بے رُخی سے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا اب اسے
رابعہ کی وہ نصائح یاد آ رہی تھیں جنہیں ایک ایک کر کے رد کر چکا تھا۔ موجودہ
حالت میں تین ہزار روپے مہیا کرنے، اس کیلئے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن
تھے عدم ادائیگی کا نتیجہ وہ جانتا تھا کہ انتہائی ذلت اور قید ہے۔ ان سب
افکار و خیالات نے راشد کا دماغ کچھ ایسا ماؤف کیا کہ وہ زندگی کا خاتمہ
کرنیکو تیار ہو گیا۔ مارفیا کی ایک پڑیا کہیں سے ڈھونڈ کر نکالی پیالی میں گھول
کر تیار ہی تھا کہ لبوں سے لگائے اور ؎

شب تاریک غم صبح تمنا ہو نہیں سکتی ۔۔۔ مری سوئی ہوئی تقدیر کیوں بیدار ہو جائے

کہتے ہوئے ناشاد زندگی کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دے کہ دو نازک ہاتھوں کی
مضبوط گرفت سے اس کا ہاتھ کانپ گیا اور زہر ہلاہل لبوں کو تر کرنے سے
پیشتر ہی زمین پر گر گیا۔ مڑ کر دیکھا تو رابعہ متوحشانہ انداز سے کھڑی کانپ

رہی تھی اور سیلابِ اشک اس کی خوبصورت آنکھوں سے رواں تھا

"اُف اُف! میرے سرتاج!! یہ آپ کیا کہنے لگے تھے؟" رابعہ نے بالآخر سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ راشد نے کربناک ہچکی سے کہا "تم نے میرے لبوں تک پہنچا ہوا جام کیوں چھین لیا؟ میری حور صفات بیوی اب میں اس لائق نہیں رہا ہوں کہ تمہیں منہ دکھا سکوں"

"آہ یہ نہ کہیئے" رابعہ نے اشک آلود آنکھوں سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ میرے مجازی خدا ہیں اور آپ ہی کے دم سے میری اُمیدوں کا قلعہ قایم ہے"

"یہ ناممکن ہے رابعہ!" راشد نے افسردگی سے کہا "اپنی اُمیدوں کا قلعہ پیوندِ سمار کردو کہ تمہارا شوہر اس وقت تین ہزار روپے کا قرضدار ہے جسکی ادائیگی وہ جان کا کفارہ دیکر ہی کرسکتا ہے اُف میرے معبود نشۂ دولت نے مجھے کیسا مدہوش کر دیا تھا کاش میں پہلے ہی سمجھ جاتا کہ ؎

ظالم ہے زندگی میں ہماری سراب کا　　ہستی تو کچھ مقابلہ کرلے حباب کا

بلند آسمان! مجھے کیا معلوم تھا کہ جس زندگی کو کیف آور اور ابدی مسرت سے لبریز سمجھتا تھا وہ محض ایک خوشگوار دھوکا ہے اور ایک بے پایاں سراب جسکی تھاہ پہنچتے ہی مجھ پر مصائب کا کوہِ عظیم ٹوٹ پڑے گا